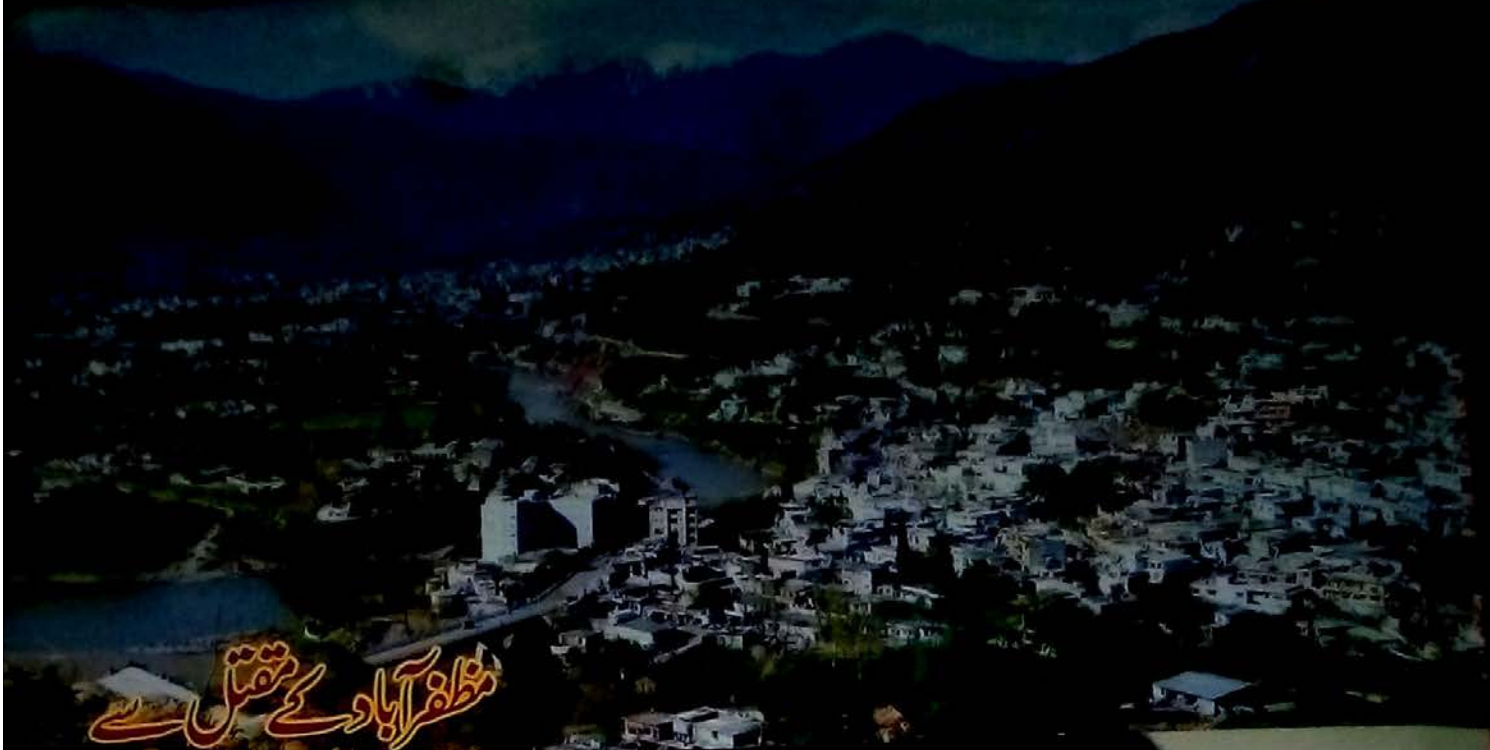


مظفرآباد کے مقتل سے

ایک ماں کی سچی کہانی



کرشنا مہتا

ایک ماں کی سچّی کہانی

کرشنا مہتا

مترجم: پروفیسر ایم اے آر کے خلیق

علم وشعور کا تابناک سفر
حقیقت کے متلاشیوں کے لیے
قدم قدم حقیقتیں

نام کتاب: ایک ماں کی سچّی کہانی
مصنّفہ: کرشنا مہتا
اردو ترجمہ: پروفیسر ایم اے آر کے خلیق
اشاعت: اکتوبر 2012ء
اہتمام اشاعت: رائل انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین آفیئرز برطانیہ
ڈسٹری بیوٹر: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نِکس) میرپور
مکان نمبر 59 سیکٹر ایف۔2 میرپور جموں کشمیر
قیمت: =/200 روپے

انتساب

اکتوبر 1947ء کو مظفر آباد میں تعینات

وزیرِ وزارت (ڈپٹی کمشنر)

دونی چند مہتا

کے نام

جس نے

قبائلی یلغار کے سامنے

سینہ سپر ہو کر

اپنے وطنِ عزیز ریاست جموں کشمیر

کی حفاظت کا عظیم فریضہ

سرانجام دیتے ہوئے

جان قربان کر دی۔

ناشر

فہرست

پیش لفظ

ریاست جموں کشمیر صدیوں سے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا مسکن رہی ہے۔اس گلشنِ جنت نظیر میں ہر رنگ و بُو اور تہذیب وتمدن کا پھول پروان چڑھتا اور نظر نواز ہوتا رہا ہے۔ ہندومت ،بدھ مت ،جین مت ،اسلام ،عیسائیت اور سکھ دھرم کے پیروکار اس خطہ ،کشمیر میں محبت ،امن ،بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا میں ہی پروان چڑھے ہیں۔دوسروں کے دین ودھرم کی روایات واقدار کی پاسداری اور لحاظ اس معاشرت کا خاصا رہا ہے۔مذہبی انتہا پسندی اور جنونیت کے لیے یہاں کی آب وہوا قطعاً مناسب نہیں رہی ۔یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا سال پر محیط اس خطے کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو تہذیبی تصادم اور مذہبی فسادات کی مثالیں نہیں ملتیں ۔مذہبی رواداری کے اعتبار سے ریاست جموں کشمیر کو ایشیاء میں ایک مثالی خطہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ریاست کے اڑوس پڑوس میں واقع مملکتیں ایسے مثالی خطے کبھی نہیں دیکھے گئے ۔یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر میں امن ،سکون ،محبت ،رواداری ،بھائی چارے اور یگانگت کا ماحول پڑوسی طالع آزما مملکتوں کو کھٹکتا رہا ہے اور وہ آئے روز ایسی سازشوں میں مصروف رہے ہیں کہ کب اور کس طرح اس خرمنِ امن پر کوئی چنگاری پھینک کر اُس کو خاکستر کردیں۔

ہزار ہا سال پر محیط ہماری تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ کشمیری معاشرہ میں دین دھرم یا مذہب کے نام پر کبھی بھی ریاستی عوام باہم دست وگریبان نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے ملک کو کبھی مذہبی فسادات کی آگ میں جھونکا ہے۔ایسا جب کبھی بھی ہوا اس میں بیرونی عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ریاست جموں کشمیر گزشتہ ساڑھے چار سو سال سے اس بدنصیبی کا شکار رہی ہے کہ اس کے پڑوسی ممالک نے اسے اپنے سامراجی مقاصد اور جارحانہ عزائم کے لیے تختۂ مشق بنائے رکھا۔یہ ریاستی عوام کی بھی نااہلی ہے کہ وہ اپنی ریاست کو بیرونی شر پسند اور امن دشمن عناصر کے اثرورسوخ سے پاک نہیں کر سکے۔بلکہ بسا اوقات ایسے مواقع پر عوام نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ بیرونی حملہ آوروں کے شانہ بشانہ خود اپنے گھر کو آگ لگانے اور اپنے عوام کو تہہ تیغ کروانے پر تیار ہو جاتے رہے۔

22 اکتوبر 1947ء ہماری قومی تاریخ کا ایک ایسا ہی سیاہ ترین اور عبرتناک دن ہے جب سرزمین

مظفر آباد جو مختلف مذاہب کا گلدستہ تھی آناً فاناً قبائلی یلغار کا نشانہ بنی اور امن ومحبت اور بھائی چارے کی فضا خوں آشام منظر پیش کرنے لگی۔ اگر لوگ باشعور ہوتے اور انہیں اپنے ملک، معاشرے اور گھر کو بچانے کا احساس ہوتا تو وہ قبائلی یلغار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوجاتے۔ لیکن افسوس صد افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ ایک طرف مظفر آباد سے سرینگر تک اور دوسری طرف بھمبر سے جموں تک غیر ریاستی مسلح دہشت گردوں نے ہمارے وطن عزیز میں داخل ہوکر قتلِ عام کا بازار گرم کر دیا۔

یہ قتل عام کرنے والے اور کروانے والے کون تھے؟ نیز ان کے عزائم کیا تھے؟ یہ راز اب پوشیدہ نہیں رہا۔ زمانہ اس حقیقت کو جان چکا ہے کہ 1947ء میں ریاست جموں کشمیر پر طاقت اور جبر کے ذریعے قبضہ کرنے کا مکروہ کھیل پاکستان کے ارباب اختیار نے شروع کیا اور اُس کے ردِّعمل میں بھارت نے بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اِن شیاطین اور سامراجی قوتوں کا یہ کھیل تادم تحریر جاری ہے اور میری دھرتی ماتا کے باسیوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے کہ ہمارے یہ بدنیّت اور بدکار پڑوسی اپنے جنم دن سے ہی ہمارے ساتھ کیا کرتے آئے ہیں اور کیا کرنے جا رہے ہیں۔

22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح پاکستان کے مسلح قبائلیوں نے جو خونی کھیل شروع کیا تھا اُسے اب پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ کھیل کھیلنے والوں کے بارے اب ہمیں کوئی نہ کوئی فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔ اِن قوتوں کا راستہ روکنا اب لازم ہو چکا ہے۔ بحیثیت قوم اگر ہم ایسا کر سکے تو ہم زندہ سلامت رہیں گے اور ہماری ریاست اپنے تشخص اور وجود کو بچا پائے گی لیکن خاکم بدھن اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو کشمیری نیست ونابود ہو جائیں گے اور ریاست جموں کشمیر دنیا کے نقشے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گی۔ اب قوم یہ فیصلہ کر لے کہ اُسے اپنے اور اپنی نسلوں کے لیے کس قسم کے مستقبل کی حکمتِ عملی طے کرنی ہے۔

میرے لیے یہ لمحہ نہایت فخر، خوشی اور مسرت کا حامل ہے کہ میں 65 برس قبل کے ایک قیامت خیز سانحہ کی ایک چشم دید داستان ''ایک ماں کی سچی کہانی'' کشمیر کی نئی نسل کے حضور پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کی مصنفہ کا تفصیلی تعارف آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں یہاں مختصراً یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب 1947ء کے فوراً بعد بھارت سے ہندی زبان میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا ''کشمیر پر حملہ'' بعد ازاں 1954ء اس کا انگریزی ایڈیشن

''KASHMIR 1947 A Survivors Story''

کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی ایڈیشن کو 2005ء میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ریاست جموں کشمیر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور کشمیر کے علمی وادبی ورثہ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ لھذا ضرورت اس امر کی تھی کہ نوجوانانِ قوم کو اس ورثہ سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اُن تاریخی سچائیوں کو جاننے کا موقع فراہم کیا جائے جس سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے اور باشعور قارئین جو اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کریں گے وہ اپنی قومی تاریخ کے بے شمار گوشوں سے کما حقہٗ آگاہ ہوں گے اور مستقبل کے لیے راہِ عمل متعین کرنے میں انھیں خاصی راہنمائی میسر آئے گی۔ کیونکہ ہمارے وطن پر قابض پڑوسی سامراج کے جارحانہ عزائم کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتے چلے جارہے ہیں اس لیے ہمیں آنکھیں کُھلی رکھنا ہوں گی اور ہوش وحواس برقرار رکھنا ہوں گے۔

کشمیر پر قبائلی حملے کے حوالے سے راقم کی تصنیف ''یادوں کے زخم'' دو سال قبل منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ اس میں چودہ ایسے عینی شاہدین کی یادیں قلم بند کی گئی ہیں جو 1947ء کے اس خوں آشام منظر کے چشم دید گواہ تھے اور مظفر آباد سے لے کر بارہ مولا تک جو قیامت ڈھائی گئی تھی اُس سے بخوبی آگاہ تھے۔ چونکہ کرشنا مہتا بھی اس سانحے کی ایک چشم دید گواہ تھیں لہٰذا اُن کی یہ کتاب اِس موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

کرشنا مہتا کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہمارے نامور دانشور اور قلم کار پروفیسر ایم اے آر کے خلیق صاحب نے کیا ہے۔ میں پروفیسر موصوف کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پیرانہ سالی میں نہایت محنت اور عرق ریزی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی مرحوم کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہی راقم کو کرشنا مہتا کی اس کتاب کی فوٹو کاپی مہیا کی تھی۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں اپنے وطنِ عزیز جموں کشمیر کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں اور دیکھیں کہ کیسے ایک ماں نے، ایک بیوی نے، ایک بہن اور ایک بیٹی نے حیرت انگیز اور غیر معمولی کردار کا مظاہرہ کیا۔ یہ کردار حُب الوطنی، انسان دوستی، دیانت داری، سچائی، انصاف پسندی، جرأت، استقلال، بے خوف، بے باکی، فہم وفراست اور دور اندیشی جیسی گوناں گوں خوبیوں کا مرقع ہے۔ ہمیں اپنی زندگیوں میں ایسے ہی اوصافِ حمیدہ پیدا کرنے ہیں۔

محمد سعید اسعد

ڈائریکٹر ادارہ نکس میرپور: 0344-5663443

Skype Id :mohammadsaeedasad E.mail:niks.mirpur@gmail.com

کرشنا مہتا

(مختصر سوانحی خاکہ)

تحریر: محمد سعید اسعد

کرشنا مہتا 4 جون 1913ء کو ریاست جموں کشمیر کے سرسبز و شاداب علاقہ کشتواڑ کے مہتا خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس خاندان کے کئی افراد ریاست میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ مہتا بستی رام 1902ء بکرمی سے 1916ء بکرمی تک لداخ کے منتظم اعلیٰ (وزیر وزارت) رہے۔ انہوں نے لداخ میں نظم و نسق قائم کرنے اور تعمیر و ترقی کے حوالے سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ کرشنا مہتا انہی کی اولاد سے تھیں۔

کرشنا مہتا کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے اور آسودہ حال ماحول میں ہوئی۔ اُن کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک سرکاری آفیسر شری دُونی چند مہتا سے ہوئی جو ریاستی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ دُونی چند مہتا لمبا قد کاٹھ رکھتے تھے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہایت ہی ایماندار، دیانتدار، فرض شناس، محبّ وطن، دلیر اور شریف النفس انسان تھے۔ وہ جموں، پونچھ اور سری نگر میں انتظامی عہدوں پر تعینات رہے۔ جولائی 1947ء میں انھیں بحیثیت وزیرِ وزارت (ڈپٹی کمشنر) مظفرآباد میں ٹرانسفر کیا گیا۔ مظفرآباد ریاست جموں کشمیر کا ایک سرحدی قصبہ تھا جو پاکستان کے قبائلی سرحدی صوبے کے ساتھ منسلک تھا۔ اپنے خاوند کی ٹرانسفر کے ایک ماہ بعد کرشنا مہتا بھی بچوں کے ہمراہ سری نگر سے مظفرآباد آ گئیں۔ مظفرآباد کی غیر یقینی سرحدی صورت حال اور پاکستان کے قبائلی علاقے سے منسلک ہونے کے پیش نظر کرشنا مہتا اس ماحول سے مانوس نہ ہو سکیں اور ایک انجاناں خوف ان کے دامن گیر رہا۔ بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جب 22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح صوبہ سرحد کی طرف سے مسلح قبائلیوں نے یلغار کرتے ہوئے مظفرآباد پر چڑھائی کر دی اور مظفرآباد میں قتل و غارت کا بازار گرام کر دیا۔ اس حملے کے دوران دونی چند مہتا نہایت دیانت داری، وفاداری اور بے خوفی کے

ساتھ حملہ آوروں کے خلاف ریاستی دفاع کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے ہوئے حملہ آوروں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

کرشنا مہتا گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنے ایک چپڑاسی کی مدد سے بچوں کو لے کر گھر سے نکل گئی اور مختلف گھروں اور دیہاتوں میں روپوش رہی اور نہایت کٹھن حالات سے دوچار رہی۔ بازیاب ہونے پر اسے بچوں سمیت حکومتی نگرانی میں رکھا گیا۔ قبائلی سرداروں اور حکومتِ آزاد کشمیر کے اعلیٰ حکّام نے ہر ممکن کوشش کی کہ کرشنا مہتا اپنے خاوند کی جدائی اور غیر مسلموں کے قتل عام کا غم بھول کر ایبٹ آباد یا مظفر آباد میں مستقلاً رہائش اختیار کر لے۔ لیکن اس کی غیرت، محبت، خودداری اور فہم و بصیرت نے ایسی تمام پیشکشیں ٹھکراتے ہوئے بالآخر قیدیوں کے تبادلے میں ہندوستان چلے جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ کرشنا مہتا، اس کے بچوں اور دیگر قیدیوں کو براستہ ایبٹ آباد، راولپنڈی لایا گیا۔ کچھ روز تک پونچھ ہاؤس میں رکھا گیا۔ پھر پاکستانی حکام نے اُنہیں جیل بھیج دیا۔ چند روز تک جیل میں رکھنے کے بعد میرپور بھیج دیا گیا جہاں دتیال گاؤں میں خواجہ عبدالعزیز نے اپنے گھر میں غیر مسلم خواتین اور بچوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ کرشنا مہتا نے اپنی داستانِ غم رقم کرتے ہوئے ہوئے خواجہ عبدالعزیز کے حُسن سلوک اور حُسن اخلاق کی بے حد تعریف کی ہے۔ دتیال کیمپ سے اِن پناہ گزینوں کو براستہ لاہور امرتسر بھیج دیا گے۔

امرتسر پہنچ کر کرشنا مہتا اپنے بچوں کے ہمراہ بی بی سنت کور کے قائم کردہ پناہ گزین کیمپ میں قیام پذیر ہوئیں۔ امرتسر میں کچھ روز ٹھہرنے کے بعد وہ کرک شٹرا کیمپ میں منتقل ہو گئیں۔ بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو جب اس پناہ گزین کیمپ کے دورے پر آئے تو کرشن مہتا نے اُن سے ملاقات کی اور اُنہیں اپنی بپتا سنائی۔ نہرو اس خاتون کی ہمت اور استقلال بھری کہانی سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اُسے اپنی منہ بولی بہن بنا کر اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ کرشنا اور اُس کے بچے پنڈت نہرو کے گھر ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے ایک ماہ تک قیام پذیر رہے۔

مئی 1948ء میں جب پنڈت نہرو نے کشمیر کا دورہ کیا تو وہ کرشنا مہتا کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں پنڈت نہرو کی تجویز پر کرشنا مہتا کو ''گاندھی سیوا سادن'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے دیا گیا جس کا کام خواتین کو گھریلو دستکاریاں سکھانا تھا۔ اس ادارے نے رفتہ رفتہ بہت ترقی کی اور اس کی بیسیوں شاخیں کشمیر کے مختلف علاقوں میں قائم کی گئیں۔ جہاں سے ہزاروں خواتین نے ہنرمندی کی تربیت حاصل کی۔ سادن کی زیر نگرانی بچوں اور مریضوں کے لیے بھی ادارے قائم کیے گے۔

کرشنا مہتا کو بھارتی لوک سبھا کا رکن ممبر نامزد کیا گیا۔ وہ پہلی کشمیری خاتون تھیں جو بھارتی پارلیمنٹ

کی رکن بنیں۔انہوں نے ایک ہندو سادھو ''مگن بابا'' سے روحانی فیض بھی حاصل کیا۔اور دس برس تک دادا.جی آشرم میں قیام پذیر رہیں اور تعلیم وتربیت سے وابستہ رہیں۔

کرشنا مہتا نے کشمیر اور بھارت میں سماجی سطح پر ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو اپنے آبائی علاقے کشتواڑ کا دورہ کروایا اور مقامی آبادی کے لیے مراعات حاصل کیں۔

کرشنا مہتا 20 اکتوبر 1993ء میں اسّی برس کی عمر میں انتقال کر گئیں اور اُن کی وصیّت کے مطابق اُن کی ارتھی کی خاک کو دریائے چندرا بھاگا (چناب) میں بہایا گیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبالؒ)

تقریظ

یہ کتاب ''ایک ماں کی سچی کہانی'' کرشنا مہتا کی آپ بیتی ہے۔ جس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں، اس لیے کہ اس نے برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں جموں کشمیر کی سازش کو طشت از بام کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اب دونوں ''دوقومی نظریے'' اور ''جموں کشمیر کی تقسیم کے حامی'' بغلیں بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ اقوام مذہب کی بنیاد پر بنتی ہیں تو دنیا کے ہر مُلک میں مختلف مذاہب کے لوگ کیسے رہ رہے ہیں۔ یہ دوسرے ممالک تقسیم کیوں نہیں ہوتے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، چین، غرضیکہ دُنیا کے ہر ملک میں دیگر تمام مذاہب کے علاوہ مسلمان بھی موجود ہیں تو وہاں تقسیم کا مسئلہ کیوں پیدا نہیں ہوتا اور پاکستان وہاں کے مسلمانوں کے لیے الگ مُلک کا مطالبہ کیوں نہیں کرتا؟

حقیقت یہ ہے کہ عقیدے کی بنیاد پر قومیں بننے یا بنانے کا کبھی بھی کوئی جواز نہیں ہوتا اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء اور رسول عربی ﷺ سب نے اپنے ہم وطنوں ہی کو اپنی قوم کے طور پر خطاب کیا ہے خواہ وہ اُنہیں مانتے تھے یا نہیں۔ دُنیا میں کہیں بھی آپ کو ایسی مثالیں نہیں ملیں گی جہاں عقیدے اور مذہب کی بنیاد پر قومیں بنی ہوں یا بنائی گئی ہوں۔ پاکستان کے علاوہ ایک اور مثال اسرائیل کی دی جاتی ہے لیکن یہ ریاست تو محض نسل کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نسل کا مذہب بھی ایک ہے۔ لیکن اِس لحاظ سے اُسے نظریاتی ریاست نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نسل کو قومیت یا قوم کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں مذہب کو نہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان واحد ریاست ہے جو نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے۔ میرا خیال ہے نہیں۔ کیونکہ پاکستان میں بیک وقت کئی نظریات متوازی چل رہے ہیں اور ابھی تک کسی ایک کو بھی حتمی (Final) فتح نہیں ہوئی۔ بہر حال یہ معاملہ ایک طویل بحث کا متقاضی ہے اس لیے اختصار کا تقاضا کرتی ہوئی اس تحریر میں اس موضوع پر مفصّل گفتگو نہیں ہو سکتی۔

برصغیر تقسیم ہوا تو دیگر خود مختار اور نیم خود مختار ریاستوں کی طرح ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ سوال دراصل فرقہ پرست قوتوں نے پیدا کیا، ورنہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ

ریاست میں حقِ حکمرانی اور جمہوریت کے لیے پہلے سے جدوجہد موجود تھی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے ہندوستان یا پاکستان میں سے کس کے ساتھ جانا ہے یا پہلے ہی کی طرح خود مختار رہنا ہے۔ کیونکہ 3 جون 1947ء کے اعلان آزادی ہند (برصغیر کی تقسیم کا قانون) کے مطابق ریاست کے لیے تینوں راستے کھلے تھے اور حکمران کو اختیار تھا کہ وہ اِن میں سے کوئی بھی فیصلہ کرسکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ریاستوں کے حکمرانوں کو فیصلہ کرنے کا یہ حق بھی مُسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے بانی جناح صاحب کی تجویز پر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ریاست کے حکمران نے اپنی ریاست کو خود مختار رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مختلف مذاہب کی حامل ریاست کا الحاق نہ تو ہندوستان کے ساتھ مناسب رہے گا اور نہ پاکستان کے ساتھ۔ مسلمان ہندوستان کے ساتھ الحاق کو قبول نہیں کریں گے اور غیر مُسلم پاکستان کے ساتھ۔ پھر انتقالِ آبادی کا مسئلہ پیدا ہوگا جس میں قتل وغارت کے امکانات کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ بعد میں ہوا بھی، بلکہ ابھی تک جاری ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ریاست کو اندرونی طور پر پہلے ہی کی طرح خود مختار رہنے دیا جائے۔ پاکستان نے اِس تجویز کو تسلیم کر کے حکمران کے ساتھ معاہدہ بھی کرلیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لیکن چونکہ نہ تو تجویز کو کھلے دِل سے تسلیم کیا گیا تھا اور نہ ہی معاہدہ کرنے میں نیک نیتی اور خلوص شامل تھا۔ پاکستان کی شدید خواہش تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ پاکستان کے ساتھ غیر مشروط الحاق کر کے ریاست سے چلا جائے لیکن مہاراجہ ہری سنگھ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اُس کی تجویز جموں کشمیر کے عوام کے لیے زیادہ بہتر تھی۔ چنانچہ پاکستان نے اُسے غیر مشروط الحاق پر مجبور کرنے کے لیے مختلف حربے آزمانا شروع کیے۔ ضروری اشیاء کی سپلائی بند کی۔ ریاست کے مُسلم اکثریتی علاقوں میں، جہاں مُسلم کانفرنس زیادہ مؤثر تھی، میں فرقہ واریّت کی آگ بھڑکانے کے لیے ہر قسم کا ایندھن فراہم کیا اور جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو 22 اکتوبر 1947ء کو اپنی فوج کی نگرانی میں قبائلیوں کا ایک بڑا لشکر مظفرآباد میں داخل کر دیا جنھوں نے ظلم و بربریّت کی نئی تاریخ رقم کی جس کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کا حکمران ہندوستان کے ساتھ الحاق پر مجبور ہوا اور ہندوستان نے 27 اکتوبر کو اپنی فوج کشمیر میں داخل کر دی۔ پاکستان نے صرف یہ نہیں کیا بلکہ اس سے تین روز قبل 24 اکتوبر 1947ء کو جموں کشمیر کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل باغی حکومت (''آزاد کشمیر'') بھی کھڑی کر دی جسے اشتعال انگیزی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ایسے میں ریاست کے حکمران کے پاس اور کونسا راستہ رہ جاتا تھا؟ اور یہ سب اس لیے ہوا کہ پاکستان نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے بدترین عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔ ساٹھ سال سے ہندوستان پاکستان اور جموں کشمیر کے عوام پاکستان کی بوئی ہوئی وہی فصل کاٹ رہے ہیں۔ جانے یہ سلسلہ

کب تک جاری رہے گا۔ کبھی ختم ہوگا بھی یا نہیں۔

اس پسِ منظر میں 22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح قبائلی لشکر مظفر آباد میں داخل ہوا اور اُسکے بعد جو کچھ ہوا وہ سب آپ ''کرشنا مہتا'' کی کتاب ''ایک ماں کی سچی کہانی''۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، پڑھیں گے۔ مجھے خدشہ ہے کہ پڑھتے وقت کئی بار آپ اپنے جذبات کو قابو سے باہر ہوتے ہوئے محسوس کریں گے۔ کیونکہ ترجمہ کے دوران کئی بار میری اپنی پلکیں بھیگتی رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی معاملات میں مجرم نہ ہونے کے باوجود میں اپنے آپ کو احساس جُرم کی حرارت سے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اس کے باوجود کہ کرشنا مہتا نے اس اندوہناک تاریخی حادثے کے سیاسی پہلو پر کوئی بات نہیں کی۔ اشارۃً بھی نہیں۔ نہ اُس نے پس منظر بتایا اور نہ ہی مُلک کے حال اور مستقبل کے بارے کوئی تبصرہ کیا۔ یوں لگتا ہے کہ مصنّفہ ایک تعلیم یافتہ اور گھریلو خاتون ہے جو آخر وقت تک اسی حیثیت سے بولتی رہی۔ اور یہی بات اس تاثر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ کرشنا مہتا نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ اس لیے کہ اُس نے بہت سے مسلمان کرداروں کی جنہوں نے کسی بھی طرح اُس کی ہمت افزائی کی، اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا یا اُس کی مدد کی دل کھول کر تعریف کی ہے حتیٰ کہ اُس نے قبائلی حملہ آوروں میں سے چند افراد کی تعریف کرنے میں کسی بُخل سے کام نہیں لیا اور یہ بہت مشکل کام تھا کیونکہ بربریّت کی تاریخ بھی اُنہی کے ہاتھ سے رقم ہوئی۔ اگر ہم غور کریں تو ہم مصنّفہ کی وسعتِ نظر اور ہمت و جرأت پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُس نے بدترین حالات کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے جیلروں (Captors) جن کے ہاتھوں وہ ناقابلِ برداشت مصائب و آلام کا شکار ہوئی کی بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ البتہ اس کے لیے اُس نے زیادہ مسرفانہ اور خوشامدانہ زبان استعمال نہیں کی اور اپنے قلم کو سنجیدگی کی راہ سے بھٹکنے نہیں دیا۔ یہ ہمارے لیے سبق آموز بھی ہے اور چشم کشا بھی کہ ہم نے انسانوں اور اکثر بے گناہ انسانوں کو آگ اور خون کے کیسے کیسے بے رحم دریاؤں میں غرق کیا۔

اس کتاب میں مصنّفہ نے اپنی زندگی کے اُن مصائب و آلام کے باوجود جو اکتوبر 1947ء میں اُسے درپیش تھے، کے ضمن میں کسی فوری اور جذباتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا جسے تعصّب، تنگ نظری اور جذباتیت پر محمول کیا جاسکے بلکہ جن احساسات، جذبات، تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا اُن کا تعلق انسان کی انفرادی اور سماج کی اجتماعی فطرت سے ہے۔ جس کے مختلف پہلوؤں کو اُس نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اِن حالات و واقعات کی ذمہ داری کا تعین کرتے وقت کسی ایک فرد گروہ جماعت یا مذہب کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ حالانکہ ان حالات کے پس منظر اور پیش منظر دونوں پر مذہب اور سیاست کی گہری چھاپ موجود ہے۔ بلکہ یہ

سارے حالات، واقعات اور حادثات مذہب اور سیاست ہی کی پیداوار تھے لیکن کرشنا نے نہ تو کسی مذہب اور نہ ہی کسی ایک سیاسی پارٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اُس نے مسلمانوں کے ہاتھوں تعصب، تسلط، تشدد اور ظلم و بربریّت کا شکار ہوتے وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور مذہب اسلام پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کی بلکہ انسان کے اندر مستقل طور پر موجود منفی قوت اور وحشی جبلت اور ساتھ ہی اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے اور استعمال کرنے والوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ میرے نزدیک مصنفہ اس لحاظ سے بھی صبر و ضبط، حوصلے، سنجیدگی اور بُردباری کی اعلیٰ منزل پر فائز ہونے کا حق رکھتی ہے کہ اُس نے اپنی اس نادر و نایاب تصنیف جو برصغیر بالخصوص جموں کشمیر، کی نئی نسلوں کے لیے بے حد اہم تاریخی معلومات کی حیثیت رکھتی ہے، کے ذریعے کسی قسم کی سیاست نہیں کی اور محض اندوہناک اور دل فگار واقعات اور حادثات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ جو بہت بڑی اور غیر معمولی بات ہے جس کی توقع ایک عام اِنسان سے نہیں کی جاسکتی۔

یہ کتاب ایک اور حوالے سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں پہلی بار اُن واقعات اور حوادث کا علم ہوا جنہیں اُس پار کے سیاستدانوں، دانشوروں اور مورخین نے اپنی کذب وافترٰی کی حاشیہ بردار محدود صلاحیتوں کے ذریعے تقریباً غائب ہی کر دیا تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو وہ شک وشبہ کی دھند اور ''جہاد'' کی مقدس اصطلاح میں لپٹا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کتاب کے انکشافات کسی جفادری اور سامری کو اس شیطانی کھیل کے مقاصد اور نتائج کو مقدس اصطلاحوں میں لپیٹ کر اپنے جرائم اور گناہوں سے بری الذمہ ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور اگر جموں کشمیر کی نئی نسل نے سنجیدگی کی راہ اختیار کی تو انہیں نام نہاد ہیروز (Heroes) کے مقام اور منصب کا از سرِ نو تحقیق کرنے کا فریضہ سرانجام دینا ہوگا جنہوں نے ایک تاریخی فراڈ کے ذریعے اُنہیں دُنیا بھر کے سامنے شرمسار کیا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ کرتے میری پوری کوشش رہی ہے کہ میں مصنّفہ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اُس کے خیالات کو من وعن اُردو میں منتقل کرسکوں یا کم از کم اُسکے اس قدر قریب اور آس پاس رہوں کہ اُسکے خیالات کی روح مجروح نہ ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ کسی بھی ترجمہ میں مصنّف کے احساسات، جذبات، تاثرات اور خیالات سب کچھ منتقل ہو لیکن ترجمہ کے اس کاروبار میں مصنّف کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خیالات کو جب ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو کہیں نہ کہیں تو یہ سب احساسات، جذبات، تاثرات، خیالات اور معنی و مفہوم اغماض اور انحراف کی زد میں آہی جاتے ہیں اور میں تو خیر کوئی سکہ بند مترجم بھی نہیں۔ تاہم مترجم کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ضرور ہونا چاہیے کہ وہ کم از کم مصنّف کے خیالات کی روح کو

مجروح نہ ہونے دے۔میں نے ترجمہ کرتے وقت یہی کوشش کی ہے۔کتنا کامیاب رہا ہوں، یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اب جبکہ کافی کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، تو مجھے ایک اور فریضہ بھی سرانجام دینا ہے اور وہ یہ کہ مجھے اور قارئین کو جموں کشمیر بالخصوص ''کشمیریت'' کے حوالے سے دانشور، ریسرچ سکالر، مصنّف اور مولّف جناب محمد سعید اسعد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب کو دریافت کیا، حاصل کیا اور اُس کے اردو ترجمے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی اور مجھے تحریک کی کہ میں اِس فرض کو سرانجام دوں چنانچہ میں نے یہ حقیری سی کوشش کی۔

پروفیسر ایم اے آر کے خلیق

051-5820162

راولپنڈی

10 اکتوبر 2012ء

1

طُوفان کے آثار

مظفر آباد کشمیر کے شمال مغرب میں سرحد کے قریب واقع ہے۔ قبائلی حملے سے پہلے یہ ریاست کشمیر ہی کا حصہ تھا۔ پہاڑوں میں محصور یہ ضلع دریائے کشن گنگا (دریائے نیلم) کے آر پار پھیلا ہوا اور سبزے سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک راولپنڈی جاتی ہے اور دوسری ضلع ہزارہ میں واقع ایبٹ آباد جو اب پاکستان کا حصہ ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر پنجاب کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ امیر ہوں یا غریب، وہ محنتی اور سادہ ہیں۔ اکثر خوش شکل اور عام طور پر تنومند ہیں۔ یہ ضلع ریاست کشمیر کی طرف سے ایک وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کے ماتحت ہوتا تھا اور اُسکے ساتھ کئی اور آفیسر مثلاً سب جج، اسسٹنٹ انسپکٹر آف پولیس، انجنیئر، اسسٹنٹ سرجن اور ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر (ڈی۔ایف۔او) بھی ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ اُسکی مدد کیلئے کرنل کی کمانڈ میں فوج کی ایک کمپنی بھی ہوا کرتی تھی۔

کشمیر کی حکومت نے میرے شوہر شری دُونی چند مہتا کو جولائی 1947ء میں وزیر وزارت کی حیثیت سے مظفر آباد میں تعینات کیا۔ اُس سے قبل وہ سری نگر میں اسسٹنٹ گورنر کے عہدہ پر تعینات تھے۔ میں اُن کے ساتھ مظفر آباد نہ جا سکی کیونکہ مجھے کچھ مہمانوں کی جو ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دیکھ بھال کرنی تھی۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ سرکاری دورہ پر سری نگر آئے اور واپسی پر بچوں کو بھی ساتھ لے گئے اور مجھے کہا کہ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔

ایک ہفتہ کے بعد میں بھی مظفر آباد پہنچ گئی۔ یہ جگہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی لیکن اس موقعہ پر جانے کیوں میں اس سے محظوظ نہیں ہوسکی۔ مجھے اپنے ماحول سے ایک مبہم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہے لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھاگ کر کہیں اور چلی جاؤں۔ میں اس قدر مایوس تھی کہ میں نے ابھی سامان تک نہیں کھولا تھا۔ میں اکثر اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ ہمیں یہاں سے نکل کر کہیں اور چلے

جانا چاہیے۔ہم یہاں نہیں رہیں گے اور میں سامان نہیں کھولوں گی۔ میرا شوہر اُن دنوں اپنے کام میں اس قدر مصروف تھا کہ اُسکے پاس میرے ساتھ بات چیت کرنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔وہ اکثر کرنل کو ساتھ لے کر سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گاؤں گاؤں دوڑتے پھرتے تھےاور کبھی اشارۃً بھی مجھے نہیں بتایا کہ کوئی ناخوشگوار بات بھی ہوسکتی ہے۔کچھ وقت کے بعد انہوں نے ہمارے بنگلے کے سامنے والی چھوٹی پہاڑی پر جنگلہ نصب کرنا شروع کیا۔ہمارا بنگلہ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے کنارے پر واقع تھا جس کے ارد گرد کھلا میدان تھااور سامنے ایک باغ تھا۔باغ اور بنگلہ لکڑی کے بنے ہوئے تختوں کے جنگلے سے محصور تھے۔پولیس کا اسسٹنٹ انسپکٹر ہمارے قریب ہی ایک بنگلہ میں رہتا تھا جبکہ ہسپتال اور ڈاکٹر کا بنگلہ کوئی دو فرلانگ دُور مسجد کے قریب واقع تھے۔ہمارے بنگلہ کی دوسری طرف گھنے جنگل کے کنارے پر مسلمانوں کی ایک زیارت تھی۔ہمارے بنگلے سے ایک تنگ راستہ (جانوروں کا راستہ) پہاڑی سے گزر کر زیارت کی طرف جاتا تھا۔لیکن لوگ بمشکل ہی اسے استعمال کرتے تھے۔کبھی کبھار کوئی تنہا کتا شکار کی تلاش میں اس راہ پر چلتا ہوا نظر آجاتا تھااور ساتھ ہی گِدھوں اور الوؤں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔

میرے مظفر آباد آنے کے تیسرے دن ''جنم اشتامی'' کا تہوار تھا۔ ہمارے گھر میں سب لوگ روزہ سے تھے اور شام کو میں اپنے ملازم کو لے کر مندر میں حاضری دینے کیلئے گئی تا کہ کُچھ نذرانہ اور پھول دیوی (Deity) کی بھینٹ چڑھا سکوں۔لیکن وہ حیرت انگیز طور پر مندر کے پھاٹک پر لڑکھڑا کر گرااور نذرانے سے بھری ہوئی پلیٹ بھی گر پڑی اور کھڑ کھڑاہٹ کی زوردار آواز آئی۔میرے ذہن میں فوری طور پر یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ آنے والے تاریک دِنوں کیلئے تنبیہ ہے۔اِسکے بعد پورے دو دن تک یہی حادثہ میرے ذہن پر سوار رہااور میں کسی اور بات کے بارے نہیں سوچ سکی۔بہر حال چند دنوں کے اندر اندر بتدریج میں یہ سب کُچھ بھول گئی۔

لیکن اس کے بعد بھی اس ماہ کے دوران عجیب و غریب واقعات رُونما ہوتے رہے۔ایک تو یہ کہ گھر کے مختلف حصوں میں کئی قسم کے سانپ دکھائی دیتے رہےاور ہم سب اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرنے لگے اور گھبرائے ہوئے سے رہنے لگے۔کبھی تو یہ سانپ بچوں کے پنگھوڑوں سے نکل پڑتے تھے،کبھی بیڈمنٹن کورٹ میں۔ایک دن تو یہ سانپ ہمارے دو ملازموں کے منہ پر اُس وقت آن گرا جب وہ سوئے ہوئے تھے۔خوش قسمتی سے اُس نے انہیں ڈسا نہیں۔یوں لگتا تھا کہ موت ہر طرف سے ہم پر حملہ آور ہونے والی ہے۔میں ہر شام کو بچوں سمیت دُعا کرتی تھی اور دُعا کرتے ہوئے اس قدر خوش رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ میں ہر وقت دُعا ہی کرتی

رہوں۔ میں اپنے گھر کو ایک آئیڈیل گھر سمجھتی تھی، اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے مجھے کبھی بوریت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال، تمام دیگر لوگوں کی طرح ہمیں بھی مشکلات درپیش ہوتی تھیں۔ جن میں مالی اور دیگر ہر طرح کی مشکلات تھیں، لیکن ان کی وجہ سے کبھی پریشان نہیں ہوئی کیونکہ میں محسوس کرتی تھی کہ میرے شوہر ان سب کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔ اگر چہ میرے شوہر ایک اہم عہدہ پر فائز تھے، پھر بھی ہم بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں نہ تو کبھی رشوت کا روپیہ پیسہ آیا اور نہ ہی رشوت کے باعث کبھی تحفے تحائف آئے۔ وہ اکثر مجھے بتایا کرتے تھے۔ ''میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ میرے بچوں کی پرورش اُسی تنخواہ پر ہو رہی ہے جو میں اپنے خون پسینے سے کما رہا ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھتی کہ ہمیں اپنے بچوں کو سادہ زندگی گزارنے کی تربیت دینی چاہیے؟ یہ دراصل اُن کے لئے بھی بہتر ہی ہوگا۔ عیش وعشرت کی زندگی بالآخر انسان کے لئے بوجھ بن کر رہتی ہے''۔

اُن کی نگرانی میں بچوں کی پرورش اُسی طرح ہو رہی تھی جس طرح وہ چاہتے تھے لیکن جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے میں خود اپنے آپ کو سادگی اور نظم وضبط میں نہیں رکھ سکی۔ خوش حال والدین کی پہلی اولاد ہونے کی حیثیت سے میں آرام وآسائش اور کثرت وفراوانی کے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ میرے اردگرد خادموں اور خادماؤں کا ایک ہجوم ہوتا تھا جس کی وجہ سے میں فطری طور پر اُمراء ورؤسا کے طرزِ زندگی کی عادی ہو گئی تھی۔ اپنے سسر کے گھر آنے کے بعد میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں اپنے شوہر کے نظریہ کے مطابق صبر وبرداشت اور راضی بہ رضا رہنے کی عادت ڈالوں لیکن اپنے آپ کو اس قسم کے نظم وضبط کے تابع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ سخت کوش زندگی گزارنے کی خواہش تو موجود تھی لیکن میں اس کا کامیاب تجربہ نہیں کر سکی اور اس سلسلہ میں میری بے بسی نے کئی بار مجھے آنسو بہانے پر بھی مجبور کیا۔

میں مظفر آباد میں رہنے کے بارے اب بھی بے آرامی اور پریشانی کا شکار تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو بتایا ''میں کچھ دنوں کے لئے سرینگر جانا چاہتی ہوں۔ بچے بے شک ادھر ہی رہیں، میں جلد ہی واپس آجاؤں گی''۔ پہلے تو انہوں نے اتفاق کر لیا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ''فی الحال مت جاؤ۔ میں کچھ فوجی آفسروں کو کھانے پر بُلانا چاہتا ہوں کیا تم اِس کے بعد نہیں جا سکتی؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

چند دن اور گزر گئے اور پھر ایک دن گھر آنے کے فوراً بعد انہوں نے کہا ''تم جانتی ہو؟ کرنل کہتا ہے کہ ہم بچوں کو سرینگر بھیج دیں اور خود اُس کی جگہ شفٹ ہو جائیں۔ وہ دومیل میں رہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں ہم کسی بھی قسم کی ایمرجنسی میں کئی جیپیں (Jeeps) اور ٹیلی فون وغیرہ آسانی سے استعمال کر سکیں گے''۔

''کیا آپ نے اُس سے اتفاق کرلیا؟''

''ارے نہیں! میں نے کرنل کو بتا دیا ہے کہ مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں کو مظفر آباد چھوڑنے سے روکوں، اس لئے میں اپنی فیملی کو بھی یہاں سے دور نہیں بھیج سکتا۔ اگر کوئی مصیبت آئی تو میری فیملی کو بھی دوسروں کے ساتھ برداشت کرنی ہوگی۔ میں اپنے فرض سے آگاہ ہوں اور اُس کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتا''۔

یہ سن کر میں بہت خوش ہوئی اور میں نے اپنے شوہر کے لئے ایک انجانی سی گہری اور خفتہ عزت محسوس کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ''میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو مضبوطی سے اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ خدا جو منصفوں اور عادلوں کو برکت دیتا ہے ہمیں بھی برکت سے نوازے''۔

اگرچہ مظفر آباد بالکل سرحد پر تھا لیکن اس کے باوجود ریاست کے حکمرانوں کی لاپرواہی کی وجہ سے اُس کی حفاظت کا کوئی مناسب انتظام نہیں کیا گیا تھا اور یہ بالکل غیر محفوظ تھا۔ دوسری چیزوں کا تو ذکر ہی کیا یہاں تو ٹیلی فون تک کا انتظام نہیں کیا گیا تھا کہ ایمرجنسی کے حالات میں پیغامِ رسانی کا مسئلہ ہی حل ہو سکے۔ لیکن حکم یہ تھا کہ کسی کو بھی خوف کے مارے یہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔

وہ سب کچھ جو میری شنید میں آیا اُس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لوگ کسی نہ کسی چیز کے واقع ہونے کی توقع کیے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرے شوہر بھی یہ سب جانتے تھے۔ عام طور پر وہ کوئی بات بھی مجھ سے خفیہ نہیں رکھتے تھے اور میں ہمیشہ فیصلہ کرنے سے قبل ہی اُن کے خیالات میں حصہ (Share) لیتی تھی۔ ہمارے درمیان کبھی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں کبھی اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی وہ ہر موقعہ پر مجھے یہ بتانا ضروری سمجھتے تھے کہ میں یہ کروں اور یہ نہ کروں۔ ہماری باہمی افہام و تفہیم مکمل اور فوری قسم کی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش اور متوازن نظر آتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ کسی حد تک تیوری چڑھائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ تاہم انہوں نے اس بارے مجھے کچھ بھی نہ بتایا کہ کیا ہونے والا ہے۔ جس کی وجہ سے میں قدرے بے آرامی اور پریشانی کا شکار رہنے لگی۔ شاید یہ اس لئے تھا کہ اُنہیں زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور وُہ تھکاوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا۔ لیکن وہ باغبانی میں پہلے ہی کی طرح گہری دلچسپی لیتے تھے اور اپنے آپ کو سبزیاں اُگانے اور مختلف پھولوں کے بیج بونے میں مصروف رکھتے تھے۔ وہ کھانا پکانے کے سلسلہ میں بھی کافی محنت کرتے تھے اور باورچی خانے میں میرے لئے کافی مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

21-اکتوبر 1947ء کو ایک کرنل، ایک کیپٹن اور چند دیگر فوجی آفیسروں کو کھانے پر بُلایا گیا۔ اُس شام بوندا باندی ہو رہی تھی اور شام کافی سرد بھی تھی۔ رات کے دس بج گئے لیکن ابھی تک کوئی مہمان نہ پہنچ سکا۔

اگر چہ وہ تمام لوگ قریب ہی پولیس سپرینٹنڈنٹ کے بنگلہ میں رہتے تھے۔میں نے چونکہ کھانا خود پکایا تھا اس لئے میں اُن کے نہ آنے سے کچھ زیادہ ہی مایوس تھی۔جب میں نے اُنہیں پیغام بھیجا تو معلوم ہوا کہ کیپٹن جیپ لے کر کہیں گیا ہوا ہے اور جوں ہی وہ واپس آتا ہے ہم پہنچ جائیں گے۔دراصل کیپٹن کہیں سرحد کا جائزہ(Reconnaissance) لینے کے لئے گیا ہوا تھا اور جب وہ واپس آیا تو اُس نے ''سب اچھا'' کی رپورٹ پیش کی۔

کھانے کے بعد جب تمام مہمان رخصت ہو گئے تو میرے شوہر بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔رات پہلے ہی آدھی گزر چکی تھی اس کے باوجود انہوں نے تمام بچوں کو اپنے پاس بُلا لیا اور اُن کے ساتھ رمی کھیلنے لگے۔میں بھی اپنے آپکو اُن سے الگ نہ رکھ سکی، لہذا اُن کے ساتھ کھیل میں شامل ہوگئی۔اسی اثنا میں اُنہوں نے چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیا۔میں حیران تھی کہ آج اُن کا ارادہ کیا ہے اور وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔میں خود تو چائے نہیں پینا چاہتی تھی لیکن اُنہوں نے اصرار کیا اور کہا۔''پیاری! مہربانی کر کے آج کی رات کچھ تو پیو، کل تمہیں یہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا اور پھر شاید تمہیں افسوس ہو کہ آج کی رات تم نے انکار کیا تھا''۔میں اُن کی اس بات سے بہت ہی پریشان اور سراسیمہ ہوگئی اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔میں نے چائے دُور پھینک دی کیونکہ کوئی چیز اس میں گر گئی تھی۔میں کسی خبطی کی طرح بار بار اُن سے پوچھ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔اس سب کی حقیقت کیا ہے؟

''ارے! کچھ بھی نہیں ہے۔میں نے جو کچھ کہا ہے یہ معنی و مفہوم سے خالی ہے اور اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے''۔

اُن کے لہجے میں بظاہر غفلت اور لاپرواہی تھی۔لیکن میں فکر مند اور پریشان تھی۔میں اُس سے زیادہ ''رمی'' نہیں کھیل سکتی تھی۔لہذا ہم نے کھیل ختم کر دیا۔رات کافی بیت چکی تھی اور بچے سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔میرے شوہر نے سب سے چھوٹے بچے کو لانے کے لئے کہا جو ہمارے سات بچوں میں سب سے چھوٹا تھا۔وہ اس چھوٹے بچے سے بہت پیار کرتے تھے اور انہوں نے کہا:

''آہا! پیاری۔اس کو دیکھو کتنی گہری نیند سو رہا ہے''۔

اُن کے اس عجیب روّیے کو دیکھ کر میں پریشان تو تھی ہی لیکن خاموش رہی۔

2

طُوفان آ گیا

میں صبح سویرے تقریباً پانچ بجے ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہوگئی اور پہاڑیوں کی مخالف سمت سے آنے والی فائرنگ کی بلند آوازوں کی بازگشت سننے لگی۔ میں دوڑ کر اپنے شوہر کے بستر کے پاس گئی تا کہ انہیں جگاؤں لیکن وہ اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں جگانے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ حملہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مجھے حملہ کے بارے کچھ خبر نہیں تھی لیکن اب تک کے کسی انجانے خوف نے یہ بات میرے منہ میں ڈال دی۔

اُنہوں نے بستر پر پہلو بدلا اور کہا کہ ''یہ حملہ نہیں ہوگا بلکہ شاید ہماری اپنی فوج نشانہ بازی کی مشق کر رہی ہوگی''۔

''لیکن آپ کیسے جانتے ہیں۔ کیا کرنل نے گزشتہ شب آپ کو بتایا تھا؟''

''نہیں تو''۔ اُنہوں نے کہا۔

''اوہ! پھر یقین کیجئے کہ یہ حملہ ہی ہے۔ مہربانی کر کے اُٹھ جائیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ آ چکے ہیں؟'' اسکے باوجود وہ یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ یہ حملہ ہی ہوسکتا ہے۔ بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے بنگلے پر فائرنگ ہو رہی ہے اور لکڑی کا جنگلہ گولیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے تو وہ بستر سے اُچھل پڑے۔ جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے اُنہیں محتاط رہنے کے لئے کہا۔ اُن کا جواب مختصر تھا۔ ''ابھی تک میرے لئے کوئی گولی بنی ہی نہیں''۔

میں اپنے بچوں کو لے کر برآمدہ میں نکل گئی اور اُس سمت دیکھنے لگی جدھر سے گولیاں آ رہی تھیں۔ مجھے کوئی آدمی تو نظر نہیں آیا لیکن گولیاں لگا تار چل رہی تھیں۔ کچھ گولیاں تو جنگلے کے تختے چیر کر بنگلے تک ہی تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود بچے ذرّہ برابر بھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ وہ اس سب کو اپنے بلند بانگ قہقہوں

میں اُڑا رہے تھے۔ گزشتہ شب بوندا باندی ہوئی تھی اور موسم قدرے سرد ہو گیا تھا، اس لئے میں نے بچوں سے اچھی طرح کپڑے پہن کر آنے کو کہا۔ میرے دونوں بیٹے سات سالہ سریش اور بارہ سالہ ویمل جلدی سے دوبارہ برآمدے میں آگئے۔ ایک نے صرف 'بُش شرٹ' پہن رکھی تھی اور دوسرے نے سویٹر۔ لیکن آپادھاپی اور جلدی کی وجہ سے وہ جوتے پہننا بھول گئے تھے۔ چاروں کی چاروں لڑکیاں بھی تماشہ دیکھنے کے لئے باہر نکل پڑی تھیں جن میں میرے شوہر کی ایک بھتیجی بھی تھی۔ وہ ہمارے پاس سری نگر میں رہنے کے لئے آئی تھی اور وہیں سے مظفر آباد آگئی۔ وہ تقریباً چودہ سال کی تھی اور ہم اُسے 'سوویدش' کہا کرتے تھے۔ میری سب سے بڑی بیٹی 'وینا' ساڑھے چودہ سال کی تھی' 'شیلا' دس سال کی تھی اور سب سے چھوٹی 'کملیش' نو سال کی تھی۔ یہ سب معصوم بچے فائرنگ کی آواز سُن کر قہقہے لگاتے اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں نہیں جانتی کہ کیوں۔ لیکن میں بھی اس صورتِ حال سے کوئی زیادہ پریشان نہیں تھی۔ تاہم جب دیکھا کہ فائرنگ کم ہونے میں نہیں آ رہی تو مجھے بچوں کو اندر چلے جانے کے لئے کہنا پڑا۔ لیکن وہ میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ اُلٹا مجھے بُزدل اور کمزور دل کہہ کر چھیڑنے لگے تھے۔

ہم ابھی برآمدے ہی میں تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر تیئس (23) سپاہیوں کو ہمراہ لے کر میرے شوہر کے پاس ہمارے صحن میں آ گیا۔ سپاہیوں میں بیس مسلمان تھے اور تین ہندو تھے۔ البتہ سب انسپکٹر ایک ہندو راجپوت تھا۔ اُس نے وزیرِ وزارت (میرے شوہر) کو مطلع کیا کہ حملہ شروع ہو چکا ہے۔ دشمن پہلے ہی دریائے کشن گنگا (نیلم) کا پُل عبور کر چکا ہے اور اب شہر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب میرے شوہر اندر آئے تو میں نے پوچھا کہ ''آپ دومیل جا کر فوج کو کیوں نہیں بُلا لیتے؟'' ''فائرنگ میں کمی آ جائے تو میں دومیل جاتا ہوں''۔ انہوں نے کہا۔

یہ وہ لمحات تھے جب میں نے انہیں آخری بار دیکھا۔ جب وہ باہر جانے لگے تو اُنہوں نے بچوں کو دیکھ کر ہنسنے کی کوشش کی۔ ''کیا تم آج انہیں چائے نہیں پلاؤ گی؟ ذرا ان کی طرف دیکھو تو سہی وہ ذرّہ بھر بھی گھبرائے ہوئے نہیں ہیں اور بالکل لا پرواہ نہیں۔ وہ بہت اہم اور اعلیٰ بچے ہیں' مجھے اعتراف کرنا چاہیے۔'' ہاں' وہ بالکل خوش تھے۔

جب میں نے دوبارہ اُن کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو وہ جا چکے تھے اور پھر...... اُسکے بعد کبھی لوٹ کر واپس نہیں آ سکے۔

جب فائرنگ شروع ہوئی تو زیادہ تر ملازمین گھر میں نہیں تھے۔ صرف ایک اوم پرکاش جو پرانا

اور وفادار ملازم تھا' ہمارے ساتھ تھا۔ گھبرائے ہوئے لوگ سارے شہر میں دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ وہ رو رہے تھے اور بین کر رہے تھے۔ اس دلدوز منظر کو دیکھ کر ہم بھی گھبرا گئے۔ اسکے فوراً بعد ایک شخص آیا جس نے اعلان کیا کہ حملہ آوروں نے ہسپتال کو آگ لگا دی ہے۔ اور وہ ہر اُس چیز کو جوان کے سامنے آتی جا رہی ہے آگ لگا رہے ہیں۔ بے بس اور بے یارومددگار مریض زندہ جلائے جا رہے تھے۔ یہ منظر انتہائی خوفناک تھا۔ ہسپتال ہمارے بنگلے سے بالکل قریب تھا۔ ایسے میں میں بچوں کو لے کر اندرونِ خانہ ایک کمرے میں چلی گئی۔ ہمارا باورچی خانہ بنگلے کے عقب میں تھا اور اس سے ذرا اور پیچھے ہماری ایک چھوٹی سی زیارت بھی تھی۔ یہاں سے ایک دروازہ مسلمانوں کی زیارت کی طرف کھلتا تھا۔ کسی اچانک جذبہ کے تحت میں نے اپنا تمام زیور اُتار کر ایک بنڈل میں باندھ لیا۔ کپڑے جو میں نے پہن رکھے تھے پرانے تھے اور مجھے گرم رکھنے کے قابل نہیں تھے لیکن عین اُس لمحے وقت کی کمی کے باعث میں مزید کپڑے پہننے کے قابل بھی نہیں تھی۔

میں جوں ہی اندر گئی تو کسی نے چیخ کر کہا پولیس سُپر یٹنڈنٹ کے بنگلے کو آگ لگ گئی ہے اور اُس سے شعلے لپک رہے ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اب میں کیا کروں۔ عین اُس وقت میں نے اپنے ایک مسلمان چپراسی کو دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے سُنا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر مجھے کہہ رہا تھا۔ ''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ حملہ آور آپ کے بیڈروم تک پہنچ چکے ہیں اور آپ یہاں ٹہل رہی ہیں۔ وہ لوگ تقریباً ساٹھ کی تعداد میں ہیں۔ کیا سُن رہی ہیں؟ اپنے بچوں کو لے کر گھر سے باہر نکل آئیں۔ ہم اُنہیں زیارت کے راستہ میں کسی جگہ چُھپا دیں گے۔''

میں بالکل دم بخود اور سراسیمگی کی حالت میں تھی۔ ''مہتاجی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہیں اور آگے چلے گئے ہیں۔ مہربانی کر کے جلدی کریں''۔

میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کیونکہ میرے شوہر اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے سلسلہ میں باہر تھے اور مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ اُن کی غیر حاضری میں میرا گھر چھوڑنا کوئی اچھی بات ہے۔ چپراسی میرے اس روّیے پر بے صبر ہوا جا رہا تھا۔

''مہربانی کر کے جلدی کریں کیونکہ ذرا بھر بھی دیر ہوئی تو ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ وہ ہر طرف آتش زنی اور قتل وغارت کرتے ہوئے جا رہے ہیں''۔ میں زیادہ دیر ایسی حالت میں نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ جلدی سے میں نے بستر کی ایک چادر اور گپتی (تلوار کی طرح کی لاٹھی) اُٹھائی اور بچوں کو لے کر ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب وہیں چھوڑ دیا۔ میں نے گپتی اس لئے اُٹھائی تھی کہ اگر آبروریزی

کا خطرہ ہوا تو میرے بچے اس کی مدد سے اپنے آپ کو ہلاک کر سکیں گے۔

ہم زیارت کی طرف چلتے گئے۔ لمحہ بھر کے لئے میں نے پیچھے مڑ کر اپنے گھر پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی جو پہلے ہی تنہائی اور ویرانی کا مجسمہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے شکر گزاری کے انداز میں سوچا کہ میں نے اس میں کتنی آرام دہ زندگی گزاری ہے۔ لیکن اب تنہائی میں ڈوبی ہوئی اس رہائش گاہ پر تاریکی کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ شاید یہ اُس انجانے مستقبل کی علامت ہے جو ہمارے مقدّر میں لکھا جا چکا ہے۔

فائرنگ جاری تھی اور یہ کانوں کو سُن کر رہی تھی۔ ہم سارا راستہ لڑکھڑاتے اور ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ کیونکہ ہماری ذرا سی غلطی سے ہم سب گدھوں کی غذا بن کر رہ جاتے۔

اب موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہم آگے چلنے کے قابل نہیں تھے اس لئے گھاس پر آرام کرنے کی غرض سے ٹھہر گئے۔ ہمارا سارا جسم بھیگ چکا تھا اور بچے سردی سے کانپنے لگے تھے۔ میں نے اُنہیں بستر کی چادر میں لیا اور وہ بیچارے گٹھڑی کی طرح اس کے نیچے آگئے۔

ایسا لگتا تھا کہ ہم فائرنگ والی جگہ کے بالکل قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ میں انتہائی سنسنی اور اداسی کے عالم میں غرق تھی۔ ہمارا ایک پرانا ملازم ہسپتال سے دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم بات ہوگی۔

میں نے اُس سے پوچھا ''تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟''

میرا بارہ سالہ بچہ ہسپتال میں تھا وہ اب آگ میں جل رہا ہے۔ سارے کے سارے مریض جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ سب زندہ جلائے جا رہے ہیں۔ اوہ میرے خدا! میں اپنے چھوٹے بچے کو کہاں سے لاؤں گا؟''

وہ ہسپتال کی طرف دوڑ پڑا۔ بعد میں ہمیں اِس ساری کہانی کا پتہ چلا کہ اُس بیچارے کی اپنی لاش ہسپتال کے قریب سے ملی جبکہ اُس کے ہاتھوں میں اپنے بچے کی جلی ہوئی لاش بھی تھی۔

ہم تقریباً ڈھائی گھنٹے تک وہاں پڑے رہے۔ سردی اتنی تھی کہ بچے زرد پڑ گئے تھے۔ اُسی اثنا میں اوم وہاں پہنچ گیا۔ وہ سارا وقت ہمیں تلاش کرتا رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے اوم؟ اور تم رو رہے ہو؟''

بچے اُسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور اُسے بھی خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ہیلو اوم! تم اتنے کمزور دِل ہو؟ دیکھو ہم بالکل ڈرے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتایا کرتے تھے کہ تم کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔ اور اب تم اپنی بات بُھول گئے ہو؟''

لیکن اوم نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُس سے دوبارہ پوچھا۔

''کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ کیا ہوا ہے۔ اور اوم! تم رو کیوں رہے ہو؟''

بولنے سے پہلے وہ ذرا سا جھجکا ''میں ابھی تک بنگلے کے اندر ہی تھا جب آپ لوگ کہیں نکل آئے۔ کوئی ساٹھ کے قریب قبائلی دروازے توڑ کر گھر کے اندر داخل ہو گئے اور سارا زیور اور کپڑے وغیرہ اُٹھا کر چلے گئے۔''

''کیا تم صرف اس لئے رو رہے ہو؟ بھائی! یہ کپڑے اور جیولری وغیرہ ہم نے بنائی تھی اور اگر ہم زندہ رہے تو ہم یہ چیزیں دوبارہ بنالیں گے۔ لیکن کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کرو گے؟ کیا تم بنگلے پر جا کر صاحب کا گرم سُوٹ لا سکو گے؟ وہ صبح محض واجبی سے کپڑے پہن کر گئے تھے جو گرم نہیں تھے اور اب انہیں سردی محسوس ہو رہی ہوگی۔''

اُس نے گہری سانس لی اور چلا گیا۔ لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔

''میں اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے کسی کو اندر کراہتے ہوئے سُنا ہے۔'' ظاہر تھا کہ وہ اِس سے زیادہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

مجھے احساس ہو گیا کہ جو کچھ اُس نے نہیں بتایا وہ اُس سے زیادہ منحوس اور بُرا ہوا ہو گا جو اُس نے بتایا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر اپنے بنگلہ کی طرف دیکھا۔ اچھے خُدا! وُہ جل رہا تھا۔ چپراسی نے بھی جو ہمارے ساتھ ہی تھا بنگلہ کو جلتے ہوئے دیکھا۔ ''اُدھر دیکھو! تمہارا گھر جل رہا ہے''۔ کملیش نے چیخ کر کہا۔ ''ماں! میری گڑیا کا گھر بھی جل رہا ہو گا اور ساری بے بس گڑیاں بھی۔ کیا ہم کسی طرح اُن کو نہیں بچا سکتے''۔ معصوم بچی ابھی تک اپنی گڑیوں کی دُنیا میں رہ رہی تھی۔

میں اُس گھر کو شعلوں میں لپٹے ہوئے اور دھوئیں کو اُوپر اُٹھتے ہوئے دیکھ کر ڈگمگا سی گئی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ میرے شوہر کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟ میں بچوں کو کہاں لے جا سکتی تھی؟ میں سوچ سوچ کر تھک گئی تھی اور میرا ذہن چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ بچے میری طرف دیکھتے تھے لیکن مجھے دیکھنے سے اُنہیں کسی قسم کا کوئی اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جبلی طور پر میرے ذہن کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چپراسی نے مشورہ دیا کہ ''ماتا جی! ہمیں یہاں سے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ میں آپ سب کو ایک نسبتاً محفوظ جگہ پر لے جاؤں گا ورنہ یہ بچے سردی میں منجمد ہو کر مر جائیں گے۔ اگر حملہ آور یہاں آ گئے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں یہ جگہ فوری طور پر چھوڑ دینی چاہیے۔'' یہ ایک افسوسناک اور حوصلہ شکن سوچ تھی کہ ہم سب

کچھ کھو چکے ہیں اور ہم سب مزید مشکلات کا سامنا کرنے والے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ ہمارا مستقبل کیا اور کیسا ہوگا۔ بچے ننگے پاؤں چلتے گئے اور بار بار اپنے جلتے ہوئے گھر کو دیکھتے تھے جو اب شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

راستے میں ہم نے دس گیارہ افراد پر مشتمل ایک گروہ دیکھا جو ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُنہوں نے سریش جو ہمارے گروہ کی قیادت کر رہا تھا، کو روکا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وُہ کس کا بیٹا ہے اور وہ کِدھر جا رہا ہے۔

حفاظتی نکتہ نظر سے یہ بتانا ٹھیک نہیں تھا کہ وُہ وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کا بیٹا ہے لیکن اُسے ہمیشہ سچ بولنے کی تربیت دی گئی تھی اس لئے وہ یہ بھی نہ چھپا سکا۔

''اوہ! ہاں۔ پھر جلدی کیجئے جناب۔ وزیر صاحب نے آپ سب لوگوں کا نوابہ کے گھر ٹھہرنے کا انتظام کیا ہے۔'' نوابہ تحصیل کا چپراسی تھا اور ہم سب کو یہ کرنا تھا کہ گرتے پڑتے کسی طرح اُس کے گھر تک پہنچ جائیں۔ اُس کا گھر ہمارے گھر سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھا اور ایک بلند ٹیلے کی چوٹی پر واقع تھا۔ وہاں سے ہو کر باقی شہر کا بھی اچھی طرح نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اُس کے کنبے اور دیگر مسلمانوں نے جو اُس کے ہاں پناہ لئے ہوئے تھے، ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انہوں نے کہا۔'' آپ ہمارے آفیسر کی شریک حیات ہیں۔ ہم آپ کی بھی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی اُن کی۔ مہربانی کر کے آپ اِسے اپنا گھر سمجھیں اور کسی قسم کا کوئی تکلف نہ کریں۔'' جب میں گھر کے اندر داخل ہوئی تو گھر کی خواتین میرے بچوں کی حالت زار پر روئے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں نے اُن سے 'مہتا جی' کے بارے پوچھا۔ لیکن ایسا لگا کہ وہ غالباً اُس تصوّر ہی سے بے نیاز ہیں کہ اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔

اسکے فوراً بعد شیوا دیال جو پولیس سپرینٹنڈنٹ کا اردلی تھا، وہاں پہنچ گیا۔ اُس کا تعلق بارہ مولہ سے تھا اور وہ اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ اُس نے اُوم کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کچھ علم ہے کہ مہتا جی کہاں ہیں؟۔

''مہتا جی میرے صاحب (سپرینٹنڈنٹ پولیس) کے ساتھ ہائی سکول کی طرف گئے تھے۔ وہ فوج کے سپاہیوں کے نرغے میں محفوظ ہوں گے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے ایک توپ (بڑی گن) بھی نصب کر لی ہوئی تھی''۔ اُس نے مجھے کچھ اس طرح کی کہانی سنائی۔

بچے سردی سے کانپ رہے تھے۔ نوابہ کی بیوی نے آگ جلائی جس پر میں نے بچوں کے کپڑے

خشک کیے۔آسمان دھوئیں کے بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دُنیا ختم ہونے والی ہے۔اڑوس پڑوس کے لوگ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے اور بہت سے اب بھی قطار در قطار پناہ لینے کے لئے نوابہ کے گھر کی طرف آرہے تھے۔میں اپنے شوہر کے بارے پوچھ پوچھ کر مایوس ہو چکی تھی۔میں نے ہر شخص سے پوچھا کہ اُسے کچھ علم ہو۔اُن سب کی اطلاعیں متضاد تھیں۔میں نے سُنا تھا کہ حملہ آور مردوں کو قتل کر دیتے ہیں اور عورتوں کو اغواء کرتے ہیں۔اور گھروں کا صفایا کرنے کے بعد اُنہیں محض کھیل تماشا کے طور پر آگ لگا دیتے ہیں۔

شام کے تقریباً چار بج چکے تھے اور بچوں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔اُنہیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔خاتون خانہ نے مکئی کی ایک روٹی پکائی جو میں نے بچوں کو دی۔میں نے پہلے اُس کے چھ ٹکڑے کئے اور پھر اُن میں تقسیم کر دی۔

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا

ہم رات دس بجے تک بیٹھے رہے۔ جب نوابہ گھر کے اندر آیا تو اُس نے اپنی بیوی کو الگ بُلا کر اُس کے کان میں سرگوشی کی اور جب وہ واپس ہمارے پاس آئی تو اُس نے اعلان کیا کہ ہمیں اُس کا گھر فوری طور پر چھوڑنا ہے۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن آپ یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتیں۔ حملہ آور یقیناً یہاں آئیں گے اور پھر آپ کو یہاں پناہ دینے کی وجہ سے ہم سب قتل کر دیئے جائیں گے۔''

''لیکن میں اس اندھیری رات میں کہاں جا سکتی ہوں جبکہ میں یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں ہوں۔''

لیکن اُس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کے شوہر نے بھی اُس کی آواز میں آواز ملائی اور کہا ''مہربانی کر کے فوراً یہاں سے نکل جائیں۔ دونوں وزیر صاحب اور سپرینٹنڈنٹ پولیس ایک جیپ پر بیٹھ کر اوڑی کی طرف نکل گئے ہیں۔ ہم آپ کو یہاں نہیں رکھ سکتے۔''

میں نے محسوس کیا کہ یہ جھوٹ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کسی بھی صورت میں سچ نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیں چھوڑ کر اِس طرح بھاگ نہیں سکتے۔'' لیکن نوابہ نے قرآن کی قسم کھا کر کہا اور زور دے کر کہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

صبح سویرے دن چڑھتے وقت جب میں اُن کے ہاں پہنچی تھی تو اُنھوں نے بڑے اشتیاق سے مجھے پناہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ بلکہ میری بے حد عزت افزائی بھی کی تھی۔ اب رات کے وقت وُہ مجھے گھر سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ اُن کے اس روّیے نے فطری طور پر میری حوصلہ شکنی کی اور میں بہت بددل ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ میں بے بس ہوں اور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے پناہ دینے سے آپ کو خطرہ ہے تو میں ہر حال میں چلی جاؤں گی۔ میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں چلی جاؤں گی۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ مجھے بحفاظت

میرے چوکیدار کے گھر پہنچادیں' یہ چوکیدار بھی مسلمان ہی تھا لیکن یہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اُس کا گھر تو نوابہ کے گھر سے کافی دُور تھا لیکن نوابہ مجھے وہاں لے جانے پر راضی ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ جوگیاں کے گاؤں تک جاؤں گا۔ اور گاؤں کا نمبردار آپ کو صبح تک چوکیدار کے گھر پہنچادے گا۔''

میں جانتی تھی کہ جوگیاں گاؤں غنڈہ گردی کی وجہ سے مشہور ہے۔ نوابہ کا لہجہ بھی اطمینان بخش نہیں تھا۔ کیا وہ کسی شرارت پر تُلا ہوا تھا؟ میں نے اُوم اور شیوا دیال کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ چپراسی جو بنگلے سے ہمارے ساتھ آیا تھا وہ بھی ابھی تک ہمارے ساتھ ہی تھا۔

پہاڑی راستہ کانٹوں اور پتھروں سے اَٹا پڑا تھا۔ کوئی ایک غلط قدم بھی مہلک ثابت ہو سکتا تھا، درندوں کی آوازیں بار بار تاریکی کو چیرتی ہوئی سُنائی دیتی تھیں۔

ہمیں وہاں سے ہو کر جلتا ہوا قصبہ (مظفر آباد شہر) ہیولے کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ اور گولیوں کی دبی دبی آوازیں بھی سُنائی دیتی تھیں۔

میں اپنے چھوٹے سے قافلے میں سب سے پیچھے چل رہی تھی۔ ہم چڑھائی چڑھ کر پہاڑی پر آبادی میں پہنچے۔ جو آدمی وہاں رہتا تھا وہ نوابہ ہی کا کوئی رشتہ دار نکلا۔ نوابہ نے اُس سے پوچھا ''کیا ہم صبح تک یہاں ٹھہر سکتے ہیں؟''

خوش قسمتی سے اُس آدمی نے انکار نہیں کیا۔ بچے اس قدر تھکے ہوئےتھیکہ وہ ایک بھی قدم آگے بڑھانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ بیچارے اس سارے عرصے میں سردی سے کانپتے رہے۔ یہ مصیبت اس لئے بھی تھی کہ اُن کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے اور اُن کے دانت بج رہے تھے۔

ہمیں ایک بستر اور ایک لحاف دیا گیا۔ بچوں کو مکئی کی ایک بڑی روٹی بھی مل گئی۔ پہلے تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے روٹی کی پیش کش قبول نہیں کرنی چاہیے لیکن جب میں نے بچوں کی آنکھوں میں بھوک دیکھی تو میں نے مجبور ہو کر اسے قبول کر لیا۔ میں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ کھانے کے بعد وہ سب سو گئے۔ میں بھی اُن کے نزدیک لیٹ گئی۔ لحاف بے حد غلیظ تھا۔ اچھے دنوں میں ہم نے نہ صرف یہ کہ اِسے بہت دُور پھینک دیا ہوتا بلکہ اُس جگہ پر جراثیم کش دوا بھی چھینکی ہوتی۔ لیکن آج ہم اس کے لئے بھی بے حد شکر گزار تھے۔

میں نے کمرے پر چاروں طرف نظر دوڑائی کئی تیز دھار نیزے بھالے دیوار پر لٹک رہے تھے۔ جس کی وجہ سے میں گھبرا سی گئی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا جب باہر سے سرگوشیوں کی آواز آنے لگی۔ میں

نے دروازہ کھول کر تاریکی میں دیکھا۔ تین آدمی ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے اُن میں سے ایک نوابہ تھا لیکن دوسرے دو آدمیوں کو میں نہیں پہچان رہی تھی۔ اُن میں سے ایک آدمی کے پاس ایک تیز دھار نیزہ بھی تھا جبکہ تیسرے کے پاس ایک کلہاڑا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اُن سے پوچھا کہ "آپ کیا سرگوشیاں کر رہے ہیں؟۔"

نوابہ اُچھل کر سامنے آ گیا اور کہنے لگا:

"مجھے ڈر ہے کہ آپ کو یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑے گی۔ کیونکہ صبح تک حملہ آوروں کے یہاں آنے کا خطرہ ہے اور پھر وہ آپ کو یہاں پناہ دینے کی وجہ سے اِن لوگوں کو بھی قتل کر دیں گے۔ کیا آپ یہ بات سمجھتی ہیں؟ اس لئے یہ جگہ بھی فوراً چھوڑ دیں۔"

اُس کے اِن الفاظ نے میرا سر چکرا دیا۔ میں نے صبح سے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پیا تھا۔ میری بد قسمتی اور بد حالی کہیں ختم ہونے والی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ لوگ میری وجہ سے نقصان اُٹھائیں۔ میں نے وہ جگہ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن میں اس جگہ کے گرد و نواح کے بارے کچھ بھی نہیں جانتی تھی اور اگر وہ بھی کہیں اور جانے کے سلسلہ میں میری راہنمائی نہ کرتا تو میں کیا کر سکتی تھی؟

"ایسا کرنا ابھی میرے بس میں نہیں کیونکہ میرے بچے گھر میں اکیلے ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہئیں تو میں آپ کو ایک گائیڈ (راستہ دکھانے والا) مہیا کر سکتا ہوں جو آپ سے بیس روپے لے گا۔"

"ارے بھائی، میرے پاس تو اس وقت بیس پیسے بھی نہیں۔"

لیکن نوابہ کے پاس کوئی اور تجویز نہیں تھی۔

"آپ کے پاس اگر کچھ نہیں ہے تو اس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ جب تک آپ اُسے بیس روپے نہیں دیں گی تو وہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اب یہ آپ تک ہے کہ آپ روپے کا انتظام کریں۔"

روپے کیسے تلاش کیے جائیں! ہمارے پاس تو بالکل کچھ نہیں تھا جبکہ نوابہ نے سنگ دلی سے اعلان کیا "پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں۔"

ایک جھٹکے سے میرے ذہن میں زیورات کا خیال آیا۔

"یہ دیکھو" میں نے ایک بالی اُس کو دکھائی۔ "کیا اس سے کام چل جائے گا؟" وہ اِس امکان پر خوش تھا اور اُس نے ایک آدمی کو باہر بھیجا۔

''مہربانی کر کے یہ اُس کو دے دیں۔''

میں نے انکار کیا۔''نہیں۔ابھی نہیں۔جوں ہی ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے۔تو یہ اُسے مل جائیگی۔''اگر وہ چاہتے تو وہ آسانی سے ہر چیز ہم سے چھین سکتے تھے اور اُس کے بعد ہمیں گھر سے بھی نکال سکتے تھے۔لیکن شاید اُس وقت اُن کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ ہمارے پاس کچھ اور زیور بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے بچوں کو جگایا۔وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔''پیارے بچو! تیار ہو جاؤ۔ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہے۔لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

ہمارا نیا گائیڈ ہمیں راستہ دکھانے لگا۔ہمیں تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنا پڑ رہی تھیں۔راستہ پہاڑی بھی تھا اور کانٹوں اور پتھروں سے اَٹا ہوا تھا۔جب ہم تھوڑا سا آگے گئے تو میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ایک سِکھ لڑکا جس کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ہمارے قافلے سے ایک آدمی نے اشارہ کیا۔

لڑکے نے ایک مشہور سِکھ کا نام لیا اور کہا کہ'' وہ اس راستے سے اپنی فیملی کے ساتھ گزرا تھا جب اُس کا دس سالہ بیٹا پھسل کر یہاں گرا تھا اور زخمی ہو گیا تھا۔اُس کی حالت بہت خراب ہے بلکہ قریب المرگ ہے۔اس لئے آپ لوگ اپنے بچوں کے بارے میں محتاط رہیں۔'' وہ جلدی میں تھا اس لئے چلا گیا اور جب وہ چلا گیا تو ہم دوبارہ تاریکی میں ڈوب گئے۔

جلد ہی ہم ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے اور میں بہت بد دل اور مایوس ہو گئی۔شیوا دیال میرے پاس آیا اور کہا۔''میں دوسروں سے ذرا آگے نکل گیا تھا جہاں میں چند ہندوؤں سے ملا ہوں۔مظفر آباد کا ایک مشہور رئیس بھی اُن کے ساتھ ہے۔اس نے مجھے بتایا ہے کہ اگر ہم محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے مسلمان گائیڈ کو واپس بھیج کر اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں۔'' شیوا دیال اس تجویز سے متفق تھا اور میں بھی۔ میں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ واپس چلا جائے اور جا کر اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے لیکن میں اُسے وہ بالی دینا نہیں بھولی جس کا میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔وہ اُسے لے کر بہت خوش ہوا اور جب اُس نے ہمیں الوداع کہا تو اس کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔

اس طرح ہم ایک دوسرے گروہ میں شامل ہو گئے جو ہم سے آگے آگے چل رہا تھا۔راستے میں ایک شخص چل کر میرے پاس آیا۔لگتا تھا کہ وہ میرے چھوٹے بیٹے کے بارے میں پریشان ہے۔اسی لئے اُس نے اُسے اُٹھا کر چلنے کی پیش کش کی۔بیچارا بچہ ہماری اس 'سرگشت' کی وجہ سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔

بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچے جسے 'بوتھا' کہتے تھے جہاں ہم نے گوردوارہ میں قیام کیا۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے لیکن ہم اندھیرے میں اُن کو پہچان نہ سکے۔

جوں جوں رات کی گھڑیاں بیت رہی تھیں، لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل رہے تھے لیکن کسی نے بھی ہمیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے اُن لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جو ہمیں یہاں لے کر آئے تھے لیکن سب اس قدر اپنے اپنے مسائل کا اس قدر شکار تھے کہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

میں شیوا دیال کی طرف مڑی۔ ''شیوا دیال! کیا کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے تم ہمیں ذلیل وخوار نہیں ہونے دو گے۔ کیا تم ایسا کرو گے؟'' اس وقت تک میں بے حد مایوس ہو چکی تھی۔

لیکن اُس کا جواب انتہائی جذباتی تھا۔ ''ماتا جی! جب تک میں زندہ ہوں میں آپ کو اور بچوں کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ مہربانی کر کے مجھ پر اس قدر بھروسہ ضرور کریں۔''

اس کے جواب سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں خوش ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے۔ ہمیں مزید یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے، وہ صبح تک یہاں ضرور آئیں گے اور گُردوارہ بھی جلا دیں گے۔ اب ہمیں کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔'' میں نے تجویز دی۔

جانے کے لیے ہمارے پاس کوئی بھی جگہ نہیں تھی اور نہ ہی ہمیں کسی راستے کا پتا تھا۔ لیکن وہاں ٹھہر کر خطرہ مول لینا بھی کسی حماقت سے کم نہیں تھا۔ اس مایوسی اور بے صبری کے عالم میں ہم نے جو راہ سامنے آئی پکڑ لی اور نکل کھڑے ہوئے۔ اور اُس منزل کی طرف چل دیئے جس کا ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ صبح کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ آگے والے راستے پر سیدھی چڑھائی ہے۔ جو شاید کسی پہاڑی کی طرف جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ ذرا آگے ہمیں لوگوں کا ایک اور گروہ نظر آیا جو لاٹھیاں لیے کھڑا تھا۔ وہ آگے آئے اور ہم سے پوچھا ''آپ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہم اپنے چوکیدار کے گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔''

انہوں نے ہمارا رستہ روک لیا اور اُن کے ترجمان نے سختی سے اعلان کیا۔ ''آپ ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ حکومت کا حکم ہے کہ اس راستے سے کوئی نہیں گزر سکتا۔'' ہم نے اس اُمید میں انتظار کیا کہ شاید ہم انہیں قائل کر کے یہاں سے گزر سکیں۔ وہ مظفر آباد ہی کے کسان تھے اور اُن کی آنکھیں خون کی پیاسی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خدا کی خاص مہربانی تھی کہ وہ ہمیں قتل کرنے سے باز رہے۔ چنانچہ ہم واپس

پہاڑی کے نیچے کی طرف چلنے لگے۔ایسا لگ رہا تھا کہ ہم جو تھوڑا بہت حاصل کر سکتے تھے وہ سب اکارت چلا جائے گا۔اب ہر قدم ایک آزمائش معلوم ہو رہی تھی۔ہم سب بُری طرح تھکے ہوئے تھے اور بچے سردی سے نیلے پیلے ہو رہے تھے۔

پہاڑی ڈھلوان سے نیچے اُترتے ہوئے ہمیں ایک بوڑھا آدمی ملا جو مسلمان تھا۔میں نے اُس سے پوچھا۔''دادا! میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی اگر آپ ایک آدھے گھنٹے کے لیے ہمیں اپنے گھر میں آرام کرنے کی اجازت دے دیں۔میں بچوں کو آگ کے پاس بیٹھا کر گرم کرنا چاہتی ہوں''۔یہ بوڑھا غریب کسان انتہائی مہربان نکلا اور ہمیں گھر لے گیا۔یہ جگہ مظفر آباد سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھی۔اُس کے گھر کے سامنے ایک برآمدہ تھا اور اندر کمرے میں چند گائیں اور بھینیس ایک طرف باندھی ہوئی تھیں۔ایک دوسرے کونے میں ایک چولہا تھا اور ایک کھونٹی کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔اُس بوڑھے آدمی کی ایک بیوی، دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔وہ ہمیں اندر لے آیا اور بڑی حلیمی سے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔پھر اُس نے اپنی بیوی سے ہمارا تعارف کرایا اور کہا کہ ''یہ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی حفاظت بھی کریں اور احترام بھی۔ذرا دیکھو! یہ کتنی مصیبت میں ہیں۔''اس نے خدا سے ہمارے لیے رحم کی دُعا بھی کی۔

بچے دوڑ کر جلتے ہوئے چولہے کے پاس چلے گئے۔اور آگ کے اردگرد ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھ گئے۔ہم نے بے حد رغبت سے اپنے ہاتھوں کو گرم کیا۔

عین اُسی وقت یہ راز بھی کھلا کہ اُس کسان کا ایک بیٹا میرے بڑے بیٹے کا ہم جماعت ہے۔کسان کا نوجوان بیٹا دوڑتا ہوا اپنے باپ کے پاس گیا اور لڑکے نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ اس کا ہم جماعت وزیر (ڈپٹی کمشنر) کا بیٹا ہے۔دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔اُن دونوں معصوم بچوں کی بے ریا خوشی کتنی صحت افزاء معلوم ہو رہی تھی۔خاتون خانہ ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ دے کر اپنے کسی کام میں مصروف ہوگئی۔اُس نے چائے بھی بنائی اور مکئی کی روٹی بھی تیار کی۔ہمیں مکئی کے بُھنے ہوئے دانے بھی پیش کیے گئے۔مجھے زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔اس لئے میں نے صرف تھوڑے سے بُھنے ہوئے دانوں ہی پر اکتفا کیا۔ٹھہرنے کے لئے جگہ، کھانے کے لئے غذا اور بچوں کی خوشی میسر آجانے پر مجھے بے انداز خوشی ہوئی۔

خاتونِ خانہ نے مجھے پوچھا کہ کیا میں اس کا پکایا ہوا کھانا پسند کروں گی یا خود پکاؤں گی۔میں نے کہا۔''کیوں نہیں۔میں وہی کھاؤں گی جو آپ نے پکایا ہوگا لیکن اس وقت فوری طور پر میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔میرے بچے البتہ کھانا ملنے پر بہت خوش ہوں گے۔''جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ لے آئے اور کھانا

پکایا۔وہ کافی غریب تھے اوران کے ہاں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ بچے ماحضر ہی پر بہت خوش تھے۔انہوں نے بعد میں ایک چارپائی بھی دی جو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ شیئر (Share) کی۔ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ہمارے جسم بے حس وحرکت پڑے ہوئے تھے جیسے اُن میں جان تک نہ ہو۔

لیکن امن ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔اب پھر باہر کچھ آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں۔کسی نے کہا کہ حملہ آور کہیں نزدیک پہنچ گئے ہیں۔میں نے شیوادیال کو جگایا اور اُسے کہا۔''اگر حملہ آور آجائیں تو قبل اس کے کہ میری بیٹیوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تم اُس تلوار سے جو سامنے دیوار پر لٹک رہی ہے ایک ایک کر کے اُنہیں قتل کردو۔'' لڑکیاں جو یہ سب کچھ سن رہی تھیں اپنے قتل ہونے کے امکان پر ذرہ بھی خوفزدہ نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ زیادہ پریشان حملہ آوروں کے تصوّر سے تھیں۔

لیکن ہمارے مقدر میں کچھ اور تھا۔وہاں بھی پڑوسی اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ ہمارا میزبان ہمیں گھر سے نکال باہر کرے۔انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اُن سب کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔بوڑھے کسان نے جھکنے سے انکار کردیا۔اُس کے عقیدے نے غضب کی صورت اختیار کرلی اور اُس نے کہا۔''میں کسی بھی شخص کو جس نے میرے گھر میں پناہ تلاش کی ہے گھر سے نہیں نکال سکتا۔ہمارے دین نے ہمیں یہ نہیں سکھایا۔'' پھر بھی اس کے پڑوسی نہ اُس سے متاثر ہوئے اور نہ ہی اس کی دلیل سے قائل ہوسکے۔وہ اب بھی بضد تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارا میزبان گھر سے کہیں باہر کسی اور جگہ چلا گیا۔ پڑوسیوں نے اس موقعہ کو ضائع نہیں کیا۔وہ اس کے ایک رشتہ دار نے جلدی سے گھر کے دوسرے افراد سے مشاورت کی اور ہمارے کمرے میں آگیا۔اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ہم سب لاشعوری طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چارپائی کے پیچھے قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ہم پر بندوق کا نشانہ باندھ کر اُس نے سنجیدگی سے حکم دیا کہ''میں کہتا ہوں۔ نکل جاؤ ورنہ میں گولی چلادوں گا۔''

یہ آدمی فوج میں رہ چکا تھا اور سرحدی صوبوں میں سروس کر چکا تھا۔میں نے فیصلہ کرلیا کہ بہتر ہے کہ اس مصیبت کا مقابلہ کرتے ہوئے گولی کھالی جائے۔میں نے اُس سے کہا۔''ٹھیک ہے۔آگے بڑھو اور گولی چلادو۔میرے لیے کہیں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کہیں اور جانے کی بالکل ہمت نہیں تھی۔اُس نے بہت دھمکیاں دیں لیکن اس کی ہر دھمکی پر میرا جواب یہی تھا کہ اگر وہ چاہتا ہے تو ہمیں گولی ماردے۔تاہم وہ ہمیں گولی مارنے کے بارے فیصلہ نہ کرسکا۔

پھر اُس نے کہا۔''ٹھیک ہے۔آپ اپنے بچوں کے ساتھ یہاں رہیں لیکن ان دوآدمیوں کو جانا پڑے گا۔انہیں یہاں سے جانا ہے۔''

وہ دوآدمی بھی یہاں رہنے سے ڈرتے تھے۔اس لیے میں نے اُن سے کہا۔''میرا خیال ہے کہ بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے چلے ہی جائیں اور ہماری وجہ سے کسی مشکل میں نہ پڑیں۔وہ جانے کے لئے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔جب وہ بچوں سے الوداع ہوئے توان کے گالوں سے آنسوؤں رواں تھے۔اوم نے وہ گیتی سنبھال لی جو میں اپنے ساتھ لائی تھی۔

اس روز ہم اسی گھر میں رہے۔بچوں کو گزشتہ اٹھتالیس گھنٹوں کے دوران کھانے کو کافی خوراک نہیں مل سکی تھی۔وہ گہری سانس لے کر پُر اثر اور جگر سوز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تھے۔میں نے اُنہیں مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔''میرے بچو! کیا میں اکثر پرانی لوک داستانوں سے اپنے قدیم ہیروؤں کی مہمات کی کہانیاں آپ کو نہیں سناتی رہی؟ تم جانتے ہو کہ وہ لوگ عزت وحُرمت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ہمیں بھی اِن قدیم آدرشوں کو یادرکھتے ہوئے اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔لہذا ہر قسم کے حالات میں مسکراتے ہوئے خوش رہنے کی کوشش کرو۔''

گاؤں کے لوگ بالخصوص مرد،لوٹ مار میں اپنا حصہ سمیٹنے کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔گھر میں صرف عورتیں ہی عورتیں رہ گئی تھیں۔سارا سارا دن صرف حملہ آوروں ہی کے بارے خبریں موصول ہوتی تھیں۔کہ وہ اب فلاں گاؤں میں ہیں اور ابھی دوسرے ہی لمحہ فلاں میں۔ہم نے سُنا کہ وہ سب کچھ جلاتے جارہے ہیں اور سب کچھ لوٹ رہے ہیں۔خواتین خوف سے کانپتی تھیں اور ہر طرف سے اُن کے لیے لعن طعن سنائی دے رہی تھی۔تاریکی گہری ہو کر رات کا روپ دھار لیتی تھی لیکن کوئی بھی سوتا نہیں تھا۔ہمارا میزبان بھی اپنے ساتھ کچھ آٹا لے کر واپس آیا جس میں سے اس نے تمام دوستوں کو بھی حصہ دیا۔

ایک بھائی کی قربانی

آدھی رات کا وقت تھا جب گھر کی مالکہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہمراہ ہمارے کمرہ میں داخل ہوئی۔اس نے کہا۔"اِسے میری مجبوری سمجھئے کہ آپ کو یہ گھر فوری طور پر چھوڑنا ہوگا۔ہم آپ کو مزید یہاں رکھنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔"

یہ خبر میرے لیے کسی صدمہ سے کم نہیں تھی۔میں نے عاجزانہ سا احتجاج کرنے کی کوشش کی۔"آپ نے ہمارے ساتھیوں کو پہلے ہی بھیج دیا تاکہ ہم یہاں رہ سکیں۔آپ کے خیال میں اس نازک لمحے میں اِن بچوں کو لے کر کہاں جاسکتی ہوں؟ برائے مہربانی ہمیں رات تو گزارنے دیں۔ہم صبح سویرے کہیں چلے جائیں گے۔"

لیکن وہ میری بات نہیں سُن رہے تھے۔ہماری میزبان کے رشتہ دار نے مشورہ دیا۔"ہم آپ کو پہاڑ کی اُس چوٹی تک راہنمائی فراہم کریں گے جہاں ہم گرمیوں میں مال مویشی (ڈھوک) لے جاتے ہیں۔وہاں اُوپر ایک غار ہے۔آپ وہاں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔اور جب کبھی ہم سے ممکن ہوا تو ہم آپ کو کھانا بھیج دیا کریں گے۔" مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پیشکش کو قبول کرنا حفاظتی نکتہ نظر سے کیسا ہے۔لمحہ بھر کے لیے مجھے خودترحمی (Self-Pity) کے شدید درد کا احساس ہونے لگا اور میں یہ نہ بھول سکی کہ میں اس مصیبت کی مستحق نہیں تھی۔

لیکن زندگی حیرتوں سے بھری پڑی ہے۔آدھی رات کے اس سمے جو کچھ بھی ہوا،اسی دوران ایک نوجوان گھر کے اندر داخل ہوا اور جب اس نے چند لمحوں تک میرے ساتھ بات چیت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں بہنے لگے۔"میں آپ کو اپنی بہن کی طرح دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔"اور مجھے یقین ہے کہ میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرکے آپ کا خیال رکھوں گا۔" میں اس اجنبی کے جذبات کے بے ساختہ اظہار سے بے حد

متاثر ہوئی۔ کسی جبلی جذبے کے تحت میں نے اپنے دوپٹے سے کپڑے کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور اسے اس کی ہتھیلی پر باندھ دیا۔ کپڑے کا یہ ٹکڑا راکھی (Rakhi) سے قریب ترین چیز تھا۔ جس کا اس وقت میں اہتمام کر سکی۔ جب کبھی عورت کسی مرد کی ہتھیلی کے گرد 'راکھی' باندھتی ہے تو وہ روایتی طور پر پابند ہو جاتا ہے کہ اُس عورت کی بہن کی طرح حفاظت کرے اور اسکے لیے قربانی دے جو بہن کی حیثیت سے اُس کا حق ہے۔ اس رسم کی تکمیل کرتے ہوئے میں نے اپنی چھوٹی انگلی سے تھوڑا سا خون نکال کر اس کی پیشانی پر تلک بھی لگایا۔ اس سب کے دوران وہ بالکل خاموش رہا اور میں نے اپنے آپ کو جذباتی طور پر بلند اور محفوظ محسوس کیا۔

میں نے اُسے وضاحتاً بتایا کہ۔ ''یہ ایک پرانی رسم ہے جو ہمایوں کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے میں آپ کو اپنا بھائی بناتی ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اس مقدّس رشتے کے تقاضوں پر پورا اتریں گے۔ اس نے ہمارے میزبان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں صبح تک وہاں رہنے دیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگلے روز وہ ہمیں اپنے گھر لے جائے گا۔ ہماری جلد روانگی کے پروگرام سے مطمئن ہو کر ہماری میزبان نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا تا کہ ہم سکون سے سو سکیں۔

صبح جب میں بیدار ہوئی تو بالکل پژمردہ سی تھی۔ میں دباؤ کی شدت سے مغلوب ہو کر رونا چاہتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں بار بار اپنے شوہر کے بارہ میں سوچتی ہوں۔ میں اس خیال کو جھٹک کر پرے نہ کر سکی کہ ان کی زندگی خطرہ میں ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے یہ آنسوؤں میرے بچوں کے لیے اچھے ثابت نہیں ہوں گے۔ انہیں ہر قسم کی حوصلہ افزائی اور شاباش، جو انہیں مل سکتی تھی، کی ضرورت تھی۔ لہذا میں نے اپنے قویٰ کو مجتمع کیا اور جا کر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

ہمارا میزبان صبح کہیں گیا ہوا تھا۔ اُن کا بارہ سالہ بیٹا وقت ضائع کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ ''چلے جائیں۔ میں آپ کو اور زیادہ یہاں ٹھہرنے نہیں دوں گا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔''

باہر کے حالات اور بھی زیادہ خوفناک تھے۔ ہمیں ایسی ایسی کہانیاں سننے کو مل رہی تھیں جنہیں سُن کر دل دہل جاتے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ گاؤں کی ہندو عورتیں آگ جلاتی تھیں اور صاف سُتھرا لباس پہن کر مقدّس اشلوکوں کا ورد کرتے ہوئے اِسی آگ میں چھلانگ لگا دیتیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے موت کو گلے لگاتی تھیں۔ جب حملہ آور آتے اور اس ویرانی کا سامنا کرتے تو اُن سے نہ رہا جاتا اس لیے وہ جلتی ہوئی خواتین کو آگ سے باہر گھسیٹ کر اور جلتی ہوئی لاشوں سے زیورات کو کھینچ کر الگ کرنا شروع کر دیتے۔ باہر یہ سب کچھ

اس وقت بھی ہو رہا تھا جب ہمیں اس گھر سے نکالا جا رہا تھا۔

خوابیدہ حسیات کے ساتھ ہم غیر ارادی طور پر چل دیئے اور جو بھی راستہ ہمارے سامنے آیا اُسی پر چل پڑے۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھے اور دیکھا کہ واقعی چٹانوں کے پیچھے ایک غار موجود ہے۔ میں نے بچوں سے کہا کہ وہ اندر جا کر چھپ جائیں اور دروازے پر بیٹھ کر باہر کی طرف بھی دیکھتے رہیں۔ میں نے یہ غار اس لیے چنا کہ راہگیروں کو میری بیٹیاں نظر نہ آسکیں۔ کوئی ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ ہمیں فائرنگ کی آوازیں بہت قریب سنائی دے رہی تھیں لیکن خوش قسمتی سے ہماری طرف کوئی گولی نہ آئی۔ بہت جلد وہ آدمی جس نے اپنے آپ کو ہماری حفاظت کے لیے وقف کیا ہوا تھا، جسے میں نے گزشتہ روز انتہائی شکریہ کے ساتھ قبول کیا تھا ہماری تلاش میں ادھر آنکلا۔ بچے اسے دوبارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ جبلی طور پر اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا اور کہا۔ ''ماں! دیکھو یہ تمہارا بھائی آیا ہے۔''

میرا بھائی چاہتا تھا کہ ہم سیدھے اُس کے گھر چلیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ بڑی حد تک مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ''میں آج صبح حملہ آوروں سے کچھ خواتین کو اپنے گھر پناہ دینے کی اجازت لینے کے لیے دو میل گیا تھا اور انہوں نے اجازت دے دی ہے۔ اب مجھے یہ خوشی ہے کہ میں کُھل کر آپ کی مدد کر سکوں گا۔ لیکن اس بارہ میں کوئی علم نہیں کہ حملہ آور کب گھر آ جائیں اور سب کے بارہ میں پوچھنا شروع کر دیں۔ ایسی صورت میں میں انہیں کیا بتاؤں؟ اگرچہ ہماری ایک دوسرے سے مشابہت نہیں ہے۔ لیکن کیا آپ محسوس تو نہیں کریں گی کہ میں انہیں یہ بتاؤں کہ آپ میری بہن ہیں جو سیالکوٹ سے آئی ہیں؟ آخر کار کسی نہ کسی طرح ان بچیوں کو بچانا تو ہے۔'' میں اس بات سے فوراً متفق ہو گئی اور شکرگزار بھی ہوئی کہ یہاں ایک مسلمان ایسا بھی ہے جو اپنے دین کے مطابق اخلاقی معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

اس کے کنبہ میں سات لوگ تھے۔ دو چھوٹی لڑکیاں، اس کی سوتیلی ماں، اس کا باپ، ایک شادی شدہ بہن اور ایک چھوٹا بھائی۔ گھر کے سامنے ایک برآمدہ تھا اور باقی صرف دو کمرے تھے جن میں ایک میں ان کے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ ہمیں جانوروں کے کمرہ ہی میں ایک بستر فراہم کیا گیا۔ گائے کا خشک گوبر ہر طرف بکھرا ہوا تھا اور اسی پر ایک چٹائی بچھا کر ہمیں سونے کے لیے کہا گیا۔ گوبر کی بو کی وجہ سے میں بیمار ہونے لگی تھی اور اوپر سے ہمیں شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہمارے سانس کی آواز بھی بلند نہیں ہونی چاہیے تاکہ کوئی ہمیں دیکھ نہ لے۔ لیکن بچے پانی لانے کے لیے بار بار باہر جانے سے باز نہیں آ رہے تھے جبکہ یہ خطرہ موجود تھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی ہمیں دیکھ لے گا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ حملہ آور مقامی مسلمانوں کو جنہیں سکھوں کی طرف سے حملہ کا خطرہ ہے اُکسا رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے لاٹھیوں، نیزوں، کلہاڑوں اور پستولوں کو جمع کر کے اسلحہ خانہ بنایا ہوا ہے۔ یہ خوفزدہ اور وحشی ہجوم گلیوں میں بھوتوں کی طرح گھومتا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بُرے وقت کا انتظار تھا۔

دن گزر گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ ہمیں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آجانے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے میزبان کی بہن پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کیونکہ اس کا باپ کہیں گیا ہوا تھا اور کافی دیر ہو جانے کے باوجود واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کی۔ ''پیاری! رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آئیں ہم کچھ توجہ کھانا تیار کرنے پر دیں۔'' وہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ فصلیں پک چکی تھیں لیکن کاٹے بغیر کھیتوں ہی میں پڑی ہوتی تھیں۔ آخر کار کچھ آٹا، چاول اور کدّو کا انتظام کیا جا سکا۔ ان کے بچے بے حد کمزور اور غذائیت کی کمی کا شکار تھے۔ میں جب انہیں باقاعدہ خوراک کی بجائے مکئی کے بُھنے ہوئے دانے کھاتے ہوئے دیکھتی تھی تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔

گاؤں کے باقی لوگ لوٹ مار میں مصروف تھے لیکن ہمارا میزبان گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرا اور دیانتدار آدمی تھا اس لیے وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار میں حصہ دار نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں اس بے ریا کردار کی دیانتداری کے لیے اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے قلیل وسائل پر بوجھ بن کر اس کی کوئی مدد نہ کر کے اچھا نہیں کر رہی۔ میں نے سویدش اور وینا کو کہا کہ وہ آٹا پیسنے میں اُن کی مدد کریں اور لڑکوں کو کہا کہ وہ مکئی کے دانے الگ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ میں خود دھان چھڑنے میں لگ گئی اور مجھے اپنی میزبان خاتون کی زبانی زندگی میں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دھان چھڑنے کے لیے اسے پاؤں کے نیچے کُچلا جاتا ہے۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا ہوا تھا۔ میرے پاؤں مسلسل چلنے سے تھک کر دُکھنے لگے تھے اور اب خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں لمحہ بھر کے لیے ماضی میں گزری ہوئی آرام و آسائش کی زندگی کو کوسنے لگی۔ اور مجھے بچوں کے بارے زیادہ ہی ڈر لگنے لگا۔ میں کسی بھی قسم کی جسمانی مشقت کے لیے موزوں نہیں تھی لیکن کیا کرتی بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ کمانا تو تھا ہی۔ خاتون خانہ نے جو عین اسی وقت وہاں پہنچی تھی، یقیناً میری آنکھوں میں آنسوؤں اور پاؤں سے خون رستے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ بہت ہمدرد تھی۔ اس نے کہا۔ ''مہربانی کر کے آپ رہنے دیں۔ میں تمہارے پاؤں میں خون دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی۔ جب تک ہم یہاں ہیں آپ کو کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میری بیٹیاں بھی وہاں آگئیں اور

ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور انھوں نے فخریہ اعلان کیا کہ ان کا کام ختم ہو چکا۔ میں نے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو سُوجھے ہوئے تھے اور ہر جگہ سے زخمی تھے۔

کھانا تیار تھا۔ بچوں نے کچھ نہ کچھ کھایا لیکن کھانے کے بعد وہ بھوکے کے بھوکے ہی رہے۔ میں نے بھی تھوڑا سا تلا ہوکدو کھایا۔ گھر کے بچوں کو بھی کھانے کے لیے کافی کچھ نہیں ملا۔ اس کے باوجود وہ خوش نظر آرہے تھے۔ میں اس غریب کسان گھرانے کی رواداری اور صبر و برداشت پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

آخر میں ہم سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ کمرہ غلیظ اور متعفن تھا۔ میرا ذہن مستقبل کی مشکلات کے بارے سوچوں سے معمور تھا۔ اس لیے میں صبح صادق تک نہ سو سکی۔ لیکن اس کے بعد جب مجھے اونگھ آئی تو میں تھکن کے مارے سو گئی۔ بچے مسلسل اپنے باپ کے بارے پوچھتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں انہیں کیا بتاؤں۔ صبح سویرے جب میں جاگی تو گائے میرے بکھرے ہوئے بالوں کو چبا رہی تھی۔ بیچاری گائے کو کیا پتہ اس نے میرے بالوں کو کھینچ کر تقریباً نکال ہی لیا تھا۔

بار بار ایک ہی کہانی دُہرائی جاتی تھی۔ بچے بہت بھوکے تھے اور کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ مایوسی میں وہ مٹھیاں بھر بھر کر مکئی کے کچے دانے کھانے لگے۔ میرا سب سے چھوٹا بیٹا بہت بُری حالت میں تھا۔ اُس کے ہاتھ زخمی تھے اور بُری طرح سُوجھے ہوئے بھی۔ اُس نے دانوں کو وہیں سے پیسنا شروع کیا جہاں سے گزشتہ دن چھوڑ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کام میں زیادہ مصروف ہو کر بے آرامی اور درد سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے رُک جانے کو کہا لیکن وہ نہیں سنتا تھا۔ اُس نے میری مداخلت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ ہی نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ کام کیے بغیر کھانا گناہ ہے؟ ہاں، میں نے ہی اُسے یہ بتایا تھا لیکن اب مجھے بچوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنی پڑ رہی تھی کہ وہ فی الحال کام کرنا چھوڑ دیں۔ اسی اثنا میں اس کنبے کی ایک سہیلی خاتونِ خانہ کو ملنے کے لیے آئی۔ ظاہر ہے کہ اس نے میرے بارے سُنا تو اسی وقت مجھے ایک مفت مشورہ دیا ''اگر تم ان بچوں کو باہر بھیجو تو مجھے یقین ہے کہ لوگ ان پر رحم کھاتے ہوئے کھانے کے لیے انہیں کچھ دے دیں گے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو تمہیں اپنے گھر رکھ سکے۔'' میرا خیال ہے کہ میں جانتی تھی کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی وجہ سے میرا گلا بند ہونے لگا۔ یہ سادہ لوح خاتون نہیں جانتی تھی کہ اگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تو میں اور میری بیٹیاں اپنی جان تک دینے کے لیے تیار تھیں۔ عین اسی وقت میزبان اور اس کا والد اندر آگئے۔ ان کے چہرے مُرجھائے ہوئے تھے۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی اور میں جاننا

چاہتی تھی کہ کیا ہوا ہے۔

اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''کچھ پڑوسیوں نے یہاں دیکھ لیا ہے اور انہوں نے قبائیلیوں کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم نے کچھ ہندو خواتین کو پناہ دی ہوئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ جب حملہ آور آئیں تو لڑکیاں کلمہ پڑھ لیں اور قسم کھا کر کہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔''

بچوں نے سکول میں کلمہ یاد کیا ہوا تھا اور میں نے میزبان کو بتایا کہ میں بھی کلمہ یاد کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں لیکن جب وقت آئیگا تو مجھے جھوٹ پر قائم رہنے سے متعلق اپنی اہلیت کے بارے شبہ تھا کہ شاید میں اپنے مذہب کے بارے جھوٹ نہ بول سکوں۔

''آج کل وہ ہندو خواتین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اغوا کر رہے ہیں۔'' بوڑھے آدمی نے اختصار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

کھانے کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خوف کی وجہ سے ہماری بھوک ختم ہوگئی۔ گھر میں ہر شخص بہت پریشان تھا کیونکہ حملہ آور اس بہانے ہر مسلمان گھر میں داخل ہونے پر اصرار کرتے تا کہ وہ دیکھ سکیں کہ کہیں گھر میں ہندو عورتیں تو چھپی ہوئی نہیں ہیں لیکن آخر میں گھر کا صفایا کر کے لے جاتے تھے۔ اکثر انہوں نے مسلمان عورتوں کو بھی اغوا کیا۔ یہ تجسس شام چار بجے تک برقرار رہا جب دو توانا اور مضبوط مسلمان مرد جو ہتھیاروں سے لیس تھے آن پہنچے۔ اُن میں سے ایک تو گاؤں کا نمبردار تھا اور دوسرے کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ ہمارے گھر دودھ لانے والا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا لیکن میں نے اُس سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اندر آیا اور آ کر ہمارے میزبان پر دھونس جمانے لگا کہ وہ ہمیں گھر سے نکال دے۔ حملہ آوروں نے ہمارا مطالبہ کیا ہے۔

اُنہوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا ڈرانے اور ستانے والی اس مخلوق کے ہاتھوں جس کے ظلم کی کوئی انتہا نہیں تھی، ہم چلتے گئے۔ میں نے اپنے بیٹوں کو بتایا۔ ''تمہیں میرے بارے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو اگر وہ تمہیں گولی مارنا چاہتے ہیں تو بہادری سے مرجاؤ۔ لیکن بھاگ کر پیٹھ میں گولی مت کھاؤ۔'' اور میں نے وینا سے کہا۔ ''اگر موت کو برداشت کرنا مشکل معلوم ہو تو ہندوستان کی قدیم زمانے کی عورتوں کو یاد کرو کہ وہ کس طرح کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جان دے دیا کرتی تھیں۔''

بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے شمار ہندو اور سکھ جمع کئے ہوئے تھے۔ دو مسلح قبائلی اُن کی نگرانی پر مامور تھے۔ ہمیں اس گروہ میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا۔ جلد ہی کئی اور حملہ آور وہاں آ گئے۔ وہ نا قابلِ

برداشت حد تک خونخوار معلوم ہوتے تھے۔

ان میں سے ایک نے مقامی مسلمانوں کے سامنے مختصر سی تقریر کی ''ان خواتین کو آج رات کے لیے یہاں رکھو۔ گائے کا بچھڑا ذبح کرو اور انہیں اُس کا گوشت کھانے پر مجبور کرو۔'' ہمیں گائے کا گوشت کھلانے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں مسلمانوں کا عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں اس تصوّر پر کانپ گئی اور خدا سے رحم کی دعا کی۔ کسی طرح میرا میزبان، میرا منہ بولا بھائی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ وہ میری حفاظت کے وعدے پر اب بھی قائم ہے۔ میں نے اپنے زیورات جو کچھ میں نے پہنا تھا اُتار کر اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس نے کہا۔ ''یہ میرے پاس مقدّس امانت کے طور پر رہیں گے۔ جب بھی آپ چاہیں واپس لے سکتی ہیں۔'' دودھ لانے والا جسے میں نے پہلے ہی پہچان لیا تھا بھی میرے پاس آیا اور مجھ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ اُس نے کہا کہ وُہ حملہ آوروں کے سامنے بالکل بے بس تھا اور اُن کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔

5

ضمیر لوٹ آتا ہے

دوسرے روز دونوں قبائلی نوجوان واپس آ گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب کو اسی روز دو میل جانا ہے۔ ہمیں بڑا گوشت کھلا کر مسلمان کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ ہر مرد اور عورت کی با قاعدہ تلاشی لی گئی۔ اُن کی کرنسی اور زیورات سب چھین لئے گئے۔ کچھ عورتوں نے کرنسی نوٹ اپنی قمیصوں اور شلواروں کے ساتھ سئے ہوئے تھے اور کچھ نے اپنے زیورات کو اپنے لباس کی سلوٹوں میں چھپا رکھا تھا۔ تلاشی انتہائی ہتک آمیز طریقے سے لی گئی۔ جن عورتوں نے کرنسی نوٹ اپنی قمیضوں میں چھپا رکھے تھے، انہیں قمیض اُتارنے پیر مجبور کیا گیا۔ اُن کی شرم وحیا کا بھی کوئی خیال نہ رکھا گیا۔

میری باری آئی۔ ایک قبائلی نے آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میرے ہونٹوں پر لاشعوری طور پر رام یعنی ہمارے خدا کا نام آ گیا۔ اس سے وہ بہت ناراض ہوا اور مجھے ایک جھٹکے سے دُور کر دیا۔ ”اس جھوٹے مذہب کو ترک کرنا سیکھو۔ کیا تم یہ کرو گی؟ پہلے مرحلے پر مجھے یہ کچھ سہنا پڑا۔

پھر انہوں نے میرے بچوں کی تلاشی لی۔ جب اُنہیں کچھ نہیں ملا انہوں نے بچوں کو میرے پاس بھیج دیا۔ میرا منہ بولا بھائی بھی یہ دیکھنے کیلئے وہاں آیا ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اُس نے قبائلیوں سے کہا کہ کیا اس ساری آزمائش کے بعد وہ ہمیں اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔ وہ میرے جانے پر تو راضی ہو گئے لیکن اس پر اصرار کیا کہ میری بیٹیاں وہیں رہیں گی۔ لیکن میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اس لیے میرا بھائی کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے واپس چلا گیا۔ اور جب وہ واپس جانے کے لیے اجازت لینے لگا تو اس کی آنکھوں میں آنسوں تیر رہے تھے۔

تلاشی جاری تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہمارے جسموں پر پورا لباس بھی نہ رہنے دیا۔ اتفاق ایسا تھا کہ میں سارے کپڑے پہن کر ہی نہیں آئی تھی۔ ورنہ مجھے بھی اسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حملہ آوروں نے گرم

ہانکے جارہے ہیں۔ہم شخصیت اور ہستی کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔اگر تم واقعی اسلامی عقیدے کے سچے پیروکار ہو تو تمہیں اس احساس اور تصور سے ہمدردی ہونی چاہیے۔برائے مہربانی ہمارے ساتھ ایک رعایت کرو۔کیا ایسا کرو گے؟ ہم سب کو اپنے سردار کے حوالے کردو۔''

تمام حملہ آور ہندوستانی زبان سمجھتے تھے لیکن اُن کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔وہ میرے ساتھ اتفاق کیے بغیر نہ رہ سکے اور کہا۔''اسلام ہمیں لوگوں کو اذیّت دینے کی تعلیم نہیں دیتا۔اس لحاظ سے تو تم ٹھیک ہو۔لیکن ہم بے بس ہیں۔ہمارا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔'' پھر بھی میرے وعظ نے انہیں تھوڑا سا نرم کردیا اور اب انہوں نے ہمیں ذرا آہستہ آہستہ چلنے کی اجازت دے دی۔

کچھ وقت کے بعد اُن میں سے ایک نے مجھے کہا۔ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک میری گفتگو کے بارے سوچ رہا تھا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔

''ہم کافی دُور سے سفر کر کے لڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ہمارے بھی ماں باپ اور بہنیں ہیں۔''اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اس کی دو بہنیں بھی جوان اور غیر شادی شدہ ہیں۔

میں نے سوچا کہ اب وقت ہے کہ میں اس پر اپنا موقف واضح کردوں۔''خیر! ایسی صورت میں تمہیں یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سے جذبات ہیں جو خاندانی زندگی کی خوشیوں اور دکھوں کو متحرک کرتے ہیں اور چھیڑتے ہیں۔ہم سب آپ سے صرف یہ توقع کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے۔'' میری اپیل نے اُن کے اندر پائی جانے والی نیکی کی حس کو متاثر کیا۔اُن کے احساس فخر و غرور نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ شرافت کے معروف تقاضوں کو نظر انداز کریں۔لیکن اگر کرتے تھے تو وہ بھی حکم کے بندے کے طور پر۔انہوں نے ایک دوسرے کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

سریش ہمارے آگے آگے حملہ آوروں کے ساتھ چل رہا تھا۔میں کچھ فاصلے سے اُسے دیکھتی رہی کیونکہ لڑکا تھکا ہوا تھا اور پیچھے رہتا جارہا تھا۔کچھ لمحات کے بعد قبائلی سریش کو لے کر واپس آئے۔اب وہ پشیمان اور ضمیر کے زندانی لگ رہے تھے۔یہ بات اُن میں سے ایک کی گفتگو سے ظاہر ہوئی کہ وہ بہت مخلص تھا۔''ہمیں حکم ماننا ہے۔یہاں اس راز کو خفیہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جانے کا حکم ہے جہاں لوگوں کو اذیّت دی جاتی ہے۔لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہم آپ اور آپ کے بچوں کی جو مدد کر سکتے ہیں کریں گے۔'' اچھے سلوک کا یہ وعدہ میرے لئے حیرت سے کم نہیں تھا۔میں حیران تھی کہ کیا اُن کے دلوں کی

ہانکے جارہے ہیں۔ہم شخصیت اور ہستی کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔اگر تم واقعی اسلامی عقیدے کے سچے پیروکار ہو تو تمہیں اس احساس اور تصوّر سے ہمدردی ہونی چاہیے۔ برائے مہربانی ہمارے ساتھ ایک رعایت کرو۔کیا ایسا کرو گے؟ ہم سب کو اپنے سردار کے حوالے کردو۔''

تمام حملہ آور ہندوستانی زبان سمجھتے تھے لیکن اُن کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔وہ میرے ساتھ اتفاق کیے بغیر نہ رہ سکے اور کہا۔''اسلام ہمیں لوگوں کو اذیّت دینے کی تعلیم نہیں دیتا۔اس لحاظ سے تو تم ٹھیک ہو۔لیکن ہم بے بس ہیں۔ ہمارا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔'' پھر بھی میرے وعظ نے انہیں تھوڑا سا نرم کردیا اور اب انہوں نے ہمیں ذرا آہستہ آہستہ چلنے کی اجازت دے دی۔

کچھ وقت کے بعد اُن میں سے ایک نے مجھے کہا۔ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک میری گفتگو کے بارے سوچ رہا تھا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔

''ہم کافی دُور سے سفر کرکے لڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ہمارے بھی ماں باپ اور بہنیں ہیں۔''اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اس کی دو بہنیں بھی جوان اور غیر شادی شدہ ہیں۔

میں نے سوچا کہ اب وقت ہے کہ میں اس پر اپنا موقف واضح کردوں۔''خیر! ایسی صورت میں تمہیں یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سے جذبات ہیں جو خاندانی زندگی کی خوشیوں اور دکھوں کو متحرک کرتے ہیں اور چھیڑتے ہیں۔ہم سب آپ سے صرف یہ توقع کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے۔''میری اپیل نے اُن کے اندر پائی جانے والی نیکی کی حس کو متاثر کیا۔اُن کے احساس فخر وغرور نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ شرافت کے معروف تقاضوں کو نظر انداز کریں۔لیکن اگر کرتے تھے تو وہ بھی حکم کے بندے کے طور پر۔انہوں نے ایک دوسرے کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

سریش ہمارے آگے آگے حملہ آوروں کے ساتھ چل رہا تھا۔میں کچھ فاصلے سے اُسے دیکھتی رہی کیونکہ لڑکا تھکا ہوا تھا اور پیچھے رہتا جارہا تھا۔کچھ لمحات کے بعد قبائلی سریش کو لے کر واپس آئے۔اب وہ پشیمان اور ضمیر کے زندانی لگ رہے تھے۔یہ بات اُن میں سے ایک کی گفتگو سے ظاہر ہوئی کہ وہ بہت مخلص تھا۔''ہمیں حکم ماننا ہے۔یہاں اس راز کو خفیہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جانے کا حکم ہے جہاں لوگوں کو اذیّت دی جاتی ہے۔لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہم آپ اور آپ کے بچوں کی جو مدد کرسکتے ہیں کریں گے۔''اچھے سلوک کا یہ وعدہ میرے لئے حیرت سے کم نہیں تھا۔میں حیران تھی کہ کیا اُن کے دلوں کی

اس تبدیلی کا باعث سریش تھا یا شاید میں نے جب اُن کے دینکے بارے بات کی تو اُن کے دل ودماغ کا کوئی نرم و نازک گوشہ متاثر ہوا۔ جو بھی ہوا، نیکی کے اس اچانک اظہار نے مجھے فوری طور پر مطمئن کر دیا۔

ہم تقریباً 10 بجے کے قریب دومیل پہنچے۔ جانوروں کا ہسپتال جو دریائے کشن گنگا (نیلم) کے کنارے واقع تھا اور جہاں سے ہو کر دریا نظر آ رہا تھا، جلنے سے بچ گیا تھا۔ ہسپتال کے کمرے کافی وسیع تھے اور ہمیں اُن میں سے ایک میں ڈال دیا گیا۔ کئی ہندو خواتین اور بچے دو تین دن پہلے سے وہاں جمع تھے۔ کمرہ تاریک بھی تھا اور گنجائش سے زیادہ ہجوم کے سبب تنگ بھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گلا دبایا جا رہا ہو اور تازہ ہوا کی خواہش کے لئے شدت بڑھ رہی ہو۔

جب ہمارا گروہ کمرے کے اندر داخل ہوا تو فی الواقعی ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ وہاں پہلے سے موجود بدقماش لوگوں کے ایک بے ڈھنگے سے گروہ نے ہمارا استقبال کیا۔ اُن میں کچھ ڈوگرہ فوج کے بھگوڑے تھے اور کچھ پاکستانی جنہوں نے اپنے آپ کو ''جہادی'' کے طور پر رجسٹر کروایا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں یوں اُچھل کود رہے تھے جیسے گندی ہوا کا جھونکا۔ وہ خواتین کے چہروں پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے اور گنواروں کی طرح ہاتھ مَل مَل کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ جبکہ یہ وحشی غوغا آرائی ہمارے کان بہرے کیے دے رہی تھی۔ انہوں نے زمین پر اصلی جہنم برپا کر رکھا تھا۔ وہ تیار تھے کہ کئی عورتوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ خواتین انکار کر رہی تھیں اور ہمیں اُن کے رونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن حملہ آوروں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ان ''جہادیوں'' کے لیے یہ آگ کا بپتسمہ (Batisma) نہیں تھا۔ وہ بہت کچھ جلا چکے تھے اور بے شمار عورتوں کی آبروریزی کر کے گناہ کے راستے پر ڈٹ چکے تھے۔ لیکن وہ دو حملہ آور جنہوں نے ہمیں یہاں لایا تھا ابھی تک اپنے وعدے پر قائم تھے۔ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے اور دوسرے حملہ آوروں سے ہمیں الگ کر دیا۔ جو زیادتیاں ہمارے اردگرد ہو رہی تھیں ہم اُن کو دیکھ کر کانپ رہے تھے لیکن کسی کو بھی ہمارے قریب آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ عین اُسی وقت ایک آفیسر جو یقیناً اُن سے سینئر ہوا ہوگا اندر آیا اور اُس نے بلند آواز سے انہیں حکم دیا کہ وہ عورتوں کو فی الحال اکیلا رہنے دیں۔ حملہ آور اس کا حکم ماننے کی بجائے اپنی غرض کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جب تمام خواتین اُٹھائی جا چکیں تو ہمیں اُن دو حملہ آوروں کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے اپنی رائفلیں نکالیں اور حفاظت کے لیے دروازے پر بیٹھ گئے۔ ایک ساتھ والے کمرے سے ہمیں سسکیوں اور چیخوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ پانی اور کھانے کے لیے چیخ رہے تھے۔ انہیں تین دن سے

بغیر کچھ کھائے پیئے بند رکھا گیا تھا۔کچھ بے ہوش ہو کر گر چکے تھے اور ان کی حالت بہت خراب تھی۔ان کی بے بس سسکیاں سننا بے حد دکھ دہ اور اذیت ناک تھا۔میں زیادہ دیر تک اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان دو حملہ آوروں سے جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے انسانیت کا مذہب قبول کر کے مجھے حیران کر دیا تھا ،بات کروں گی۔میں نے اُن سے درخواست کی کہ دوسرے کمروں میں بند قیدیوں کے لیے کہیں سے پانی لا دیں۔دوسری مرتبہ بھی معجزہ ہی ہو گیا۔وہ فوراً تیار ہو گئے اور جا کر ایک گھڑا پانی لے آئے۔ہم دوڑ کر دوسرے کمرے میں گئے۔یہ بہت تاریک تھا اور کوئی پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ پانی کی سب سے زیادہ ضرورت کس کو ہے۔لیکن ہر قیدی نے پانی پیا اور جلد ہی گھڑا خالی ہو گیا۔

اُن میں کچھ بے ہوش ہو کر گرے ہوئے تھے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ایسا اندوہناک منظر تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا۔

ماؤں نے اپنے بچوں کو مار دیا تھا کہ کہیں کوئی اُن کی بے حرمتی نہ کرے۔ہر طرف رونے اور آہ وزاری کا سماں تھا۔لوگوں کے لیے اپنی زندگی بچانا مشکل ہو گیا تھا۔کچھ نے اپنے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا لیکن کچھ دوسروں نے لڑائی کا فیصلہ کیا۔کئی زندگیاں تو پہلے ہی ضائع ہو چکی تھیں۔

یہ سب کچھ ان خواتین کے لئے مشکل اور ناممکن آزمائش کی طرح تھا۔ایک ایسی آزمائش جس میں خوف ودہشت اور نہ ختم ہونے والا انتظار تھا۔وہ ایک ایسے بے آبرو انجام کی منتظر تھیں جس میں یقینی لڑائی کا سامنا کرنے کے لیے نہ ختم ہونے والا انتظار بھی برداشت کرنا تھا۔یہ انتظار ایک روح کُش تجربہ تھا اور جب وہ لڑائی قریب آئی تو اس نے ایسی چوٹ لگائی جو نا قابل برداشت تھی کیونکہ اُن کے اعصاب اس کے انتظار میں پہلے ہی دندانہ دار ہو چکے تھے۔وہ اٹھیں اور انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی جان لے لی کیونکہ وہ اس طرح اپنی موت کا مزید انتظار نہیں کر سکتی تھیں جبکہ اُن کے معدے بالکل خالی تھے۔اُن سب نے موت کو اس لیے ترجیح دی کہ اُنہیں اپنی عزت ہر چیز سے پیاری تھی اور وہ آبروریزی کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔وہاں حفاظتی عملہ اتنا نہیں تھا جو ان سب کی نگرانی کر سکے اس لیے انہوں نے بھاگ کر دریائے کشن گنگا (نیلم) میں چھلانگ لگا دی۔خود چھلانگ لگانے سے پہلے انہوں نے اپنے چیختے ہوئے بچوں کو دریا میں پھینکا۔آہستہ اور دھیرے دھیرے بہتے ہوئے دریا نے اُن سب کو نگل لیا۔نہ صرف ان کے جسموں کو بلکہ ان کے مصائب کو بھی۔

قبائلی سرداروں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کچھ ہو رہا ہے تو انہیں یہ بات بہت بُری لگی کہ اتنی ساری خواتین اس قدر آسانی سے اپنی عزت بچا کر بھاگ جائیں۔اُنہیں زیادہ اطمینان تب ہوتا کہ یہ خواتین

فوراً مرنے کے بجائے آہستہ آہستہ اذیت کے ذریعے ماری جائیں۔ اس لیے زیادہ مرد وہاں بھیج دیے گئے۔ سخت حفاظتی نظام قائم کیا گیا۔ مردوں کو عورتوں سے الگ کر کے دُور لے جایا گیا جبکہ ہر ایک کو یقین تھا کہ ان مردوں کو ذبح کرنے کے لئے لے جایا جارہا ہے۔ جدائی کے وقت دردناک مناظر دکھائی دیئے۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، اور چیخ رہے تھےکہ اُنہیں والدین سے الگ نہ کیا جائے۔

جب سب چلے گئے تو دونوں نوجوان حملہ آور دوست واپس آئے۔ اُن میں سے ایک نے کمبل نیچے بچھایا اور سویدش اور وینا کو اس پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے دوسرا کمبل لے کر اُن کے اُوپر پھینک دیا۔ کئی محافظ (Guards) جو اُسی دن وہاں پہنچے تھے، وہاں سے گزرتے اور بلاناغہ پوچھتے کہ ان کمبلوں کےنیچے کون سویا ہوا ہے۔ جس کا جواب وہ دونوں نوجوان حملہ آور خود یہ کہہ کر دیتے تھے کہ اس کے نیچے سپاہی آرام کررہے ہیں۔ وہ بغیر کسی وقفے اور ناغے کے نگرانی کررہے تھے کہ وہاں ایسا ویسا کوئی نہ آجائے۔ اُنہوں نے کھانے کے لیے بھی وقفہ نہیں کیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ شاید ہمیں دریافت کرلیا جائے گا۔

عین اُسی لمحے کچھ قبائلی جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے گروہ سے کئی خواتین کو اُٹھا کر لے گئے تھے واپس آگئے۔ اُن میں کچھ جموں اور میرپور کے مسلمان فوجی بھگوڑے بھی تھے۔ پہلے ہی کی طرح ہاتھاپائی دوبارہ شروع ہوگئی۔ ہر عورت ڈری اور سہمی ہوئی کئی حملہ آوروں میں گھری ہوئی تھی۔ ریاستی فوج کے بھگوڑے اور باغی قبائیلوں سے زیادہ بُرے ثابت ہورہے تھے۔ کیونکہ وہ زیادہ سنگدل اور ظالم تھے۔ وہ ماؤں کی گود میں میٹھی نیند سوئے ہوئے بچوں کو زور سے کھینچ کر الگ کرتے اور انہیں زمین پر پٹک کر عورتوں کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے جاتے۔

کچھ حملہ آوروں نے کمرے کے اُس حصے کی طرف دوڑ لگائی جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے دونوں پٹھان دوستوں نے جواب بھی محافظ کے طور پر کھڑے تھے دو چار کی کھوپڑی پر اپنی بندوقوں کے بٹ مارے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور غلیظ گٹھڑی کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگئے۔ دوسروں نے قریب آنے کی ہمت نہ کی کیونکہ دونوں پٹھان اُن کو ڈرا کر واپس کردیتے تھے۔ ''ادھر آنے کی جرأت نہ کرنا اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم تمہاری کھوپڑیاں توڑ دیں گے۔'' انہوں نے دھمکی دی۔

میں سوچ کر حیران ہوتی تھی کہ یہ بیچارے ان وحشی درندوں کو کب تک روک سکیں گے۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر یہ پھسل کر ٹوٹ گئے تو مجھے بھی اپنے بچوں سمیت دریا میں چھلانگ لگانی ہوگی۔ حالانکہ ایسی موت کا خیال بھی بدمزہ اور بددل کردیتا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ ہر طرف دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ دونوں پٹھانوں میں سے ایک میرے

پاس یہ تجویز لے کر آیا۔''ہم اپنے دو دوستوں کو آپ کا خیال رکھنے کے لیے چھوڑ کر جائیں گے۔ میں ان لڑکیوں کو زیادہ دیر تک آپ کے پاس محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ہم پر بھروسہ کریں اور انہیں یہاں سے کہیں اور لے جانے دیں۔ اب تک ہم نے واقعی بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے لیکن اگر کسی طرح صبح تک کسی اور کو ان کا پتا چل گیا تو یہ انکشاف بے حد خطرناک اور خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جوں ہی ہمیں ان کی حفاظت کا یقین ہو گیا تو ہم انہیں واپس لے کر آ جائیں گے۔ آپ کو بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے فوراً اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور وہ سویدش اور وینا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دو نئے نگران جو اُن کی جگہ آئے درحقیقت سادہ ذہن کے پٹھان تھے اور انہوں نے میرے بچوں کو ٹوکری بھر کر سیب، الغوزے اور خوبانیاں دیں۔ بچوں کے چہرے پھل دیکھ کر چمک اُٹھے۔ وہ کئی دن سے بھوکے تھے۔

میں نے اپنے نئے نگرانوں سے پوچھا۔''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں کے ضلعی آفیسروں کے ساتھ کیا ہوا؟'' میں نے اندازہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس لیے میں نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ''میرے شوہر بھی اُنہی میں تھے۔ وہ یہاں وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) تھے۔''

اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔''میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن میں سے آپ کا شوہر کون سا تھا لیکن ہمیں حکم تھا کہ ہم اُن سب کو قتل کر دیں''۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اس خیال کا سامنا نہ کر سکی کہ میرے شوہر بھی ان آفیسروں میں شامل ہوں گے جنہیں اِن حملہ آوروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

حملہ آوروں کے بارے سوچتے ہوئے میرا ذہن منتشر تھا اور مجھے اُس وقت اِن چار پٹھانوں کا خیال آیا کہ یہ دوسروں سے کتنے مختلف ہیں اور وہ مجھ پر کتنے مہربان رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ دوسرے بھی پیدائشی طور پر اتنے ہی اچھے ہوں گے اور میں نے چیخ کر کہا۔''تم فرشتے ہو جنہیں خدا نے میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔'' ان الفاظ نے اُن میں بھی اسی قسم کا رجحان (موڈ) اُبھارا اور انہوں نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا۔ انہوں نے خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی اُن کے ساتھ کلمہ پڑھوں۔ میں نے سوچا کہ اِن کی خواہش کا احترام مناسب ہوگا اس لیے مجھے اپنے ساتھیوں کی اس چھوٹی سی خودنمائی کو سہلانے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ جب انہوں نے کلمہ پڑھا تو میں نے بھی لفظ بہ لفظ اُن کی پیروی کی۔

اتنے میں حملہ آوروں کا ایک اور گروہ آ گیا۔ دوسرے کمرے سے دوبارہ دردناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اُن میں سے دو نے ہمارے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی لیکن میرے دو ساتھیوں نے اُنہیں ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا جس کی وجہ سے میں اِن دونوں کی نیک نیتی کی بھی قائل ہو گئی۔ جوں ہی کچھ وقت گزرا

ایک پٹھان نے مجھے مشورہ دیا۔"کیا آپ ہمارے ساتھ ہمارے ملک چلنا پسند کریں گی؟ ہم آپ کے رہنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرلیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ جگہ مسجد کے اندر ہو۔اور اگر آپ چاہیں تو وہاں آباد ہونے میں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔" مجھے انتہائی نرمی سے دینتبدیل کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں اس فکرمندی کے لیے فراوانہحد تک اُن کی شکرگزار تھی لیکن میں نے وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں شوہر اور بچوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنے ملک سے کہیں دور نہیں جاسکتی۔اس کے علاوہ میں نے اُنہیں یہ بھی یاد دلایا کہ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی کہ میں کسی قسم کی خانقاہ کا سہارا لوں۔

ہم ابھی یہ گفتگو کررہے تھے کہ دوسرے کمرے سے مجھے چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے خواتین کو چیختے ہوئے سنا کہ وہ اپنی بے عزتی اور آبروریزی کی بجائے موت کو ترجیح دیں گی۔اس کے باوجود انہیں ایسے ہوس پرست، شیطان صفت اور وحشی مردوں کی ہوس مٹانے کے لیے جن جیسوں کے منہ پر کبھی انہوں نے تھوکا تک نہیں تھا، گھسیٹ کر لے جایا گیا۔

6

اجتماعی خودکُشی

آج کا طلوعِ آفتاب ہماری مایوسیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میری بیٹیاں تو شاید اپنے محافظوں کے ساتھ اب تک کسی محفوظ جگہ پہنچ چکی ہوں گی۔ دوسری خواتین میرے اس روّیے پر حیران تھیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ حماقت کی انتہا تھی کہ میں نے اپنی بیٹیاں دو ایسے ناواقف حملہ آوروں کے ساتھ بھیج دی ہیں جو امکانی طور پر کسی بھی وقت دغاباز ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دو ایسے آدمی تھے جن کے پاس پہلے بھی اپنا ارادہ بدل لینے کے لیے کافی وقت تھا اور اگر وہ چاہتے تو گزشتہ شب کچھ بھی کر سکتے تھے انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کار اُس بات کی بھی تو کوئی اہمیت ہے کہ انہوں نے اپنے وعدے پر قائم رہنے کے لیے اپنی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈالے رکھا۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ مجھے بہر حال اُن پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ مزید برآں مجھے دو خطرات میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا: کچھ بھی ہوا گر لڑکیاں یہیں رہتیں تو اُنہیں جلد یا بدیر اس بے عزتی اور آبروریزی کا سامنا کرنا ہی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکیوں کو ان دو آدمیوں کے حوالہ کرنے میں پہلے کے مقابلے میں کم خطرہ تھا۔ اور پھر کیا میری بیٹیوں کو یہ علم نہیں تھا کہ اگر ایسا کوئی واقعہ درپیش ہو تو انہیں کیا کرنا ہے؟

تھوڑی دیر بعد ہمیں کچھ وقت کے لیے باہر جانے کو کہا گیا۔ حملہ آور ہمیں لے کر کمرے سے باہر آئے اور دریا کے کنارے چلتے چلتے دو میل کے پُل تک پہنچ گئے۔ جو کچھ میں نے وہاں دیکھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس سے قبل میں یہ تو سنتی رہی تھی کہ کتنی ہی عورتوں نے دریا میں چھلانگ لگائی لیکن یہ المناک منظر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی جس میں انسانیت رضا کارانہ طور پر زندگی کی نعمت سے دستبردار ہو رہی تھی اور وہ بھی کسی بڑے مقصد کے بغیر۔ کچھ خواتین جن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ابھی دریا کے کنارے کھڑی تھیں اور کچھ پہلے ہی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے بچوں کو دریا کی تیز

لہروں کے حوالے کیا اور اُن کی چیخ و پکار کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کی۔ زندگی نیستی کی ضد ہے اور مفقود ہونے سے انکار کرتی ہے۔ بچے جب دریا میں ڈوب کر ابھرتے تھے تو اُن کے ننھے سر ایک دو مرتبہ نظر آتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے ڈوب جانے سے پہلے اُن کے چہروں پر درد و کرب اور اذیّت دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ مائیں یہ سب کچھ خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں۔ کئی دنوں کی اذیّت نے اُن کے چہروں کے رنگ اور ہر قسم کے جذبات کو دھو ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ خود دریا میں کود جاتیں اور سارا کھیل پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتا تھا۔

اسی اثنا میں دریا کے کنارے پر کھڑے بچے یہ جان لیتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور اس یقینی جبلت، جو انسان اور جانور میں مشترک ہے، کے ذریعے انہیں موت کا رنگ و بُو واضح طور پر محسوس ہونے اور دکھائی دینے لگتے تھے۔ وہ دوڑ کر اپنی ماؤں کے پاس جاتے تھے اور اُن کے ایک طرف کھڑے ہو کر مایوسی کے نتیجے میں ودیعت ہونے والی طاقت کے بل بوتے پر کبھی جُدا نہ ہونے کے لیے اُن کے گھٹنوں سے لپٹ جاتے تھے۔ حملہ آور لاکھ کوشش کرتے تھے کہ اِن عورتوں کو اس طرح مرنے نہ دیا جائے۔ وہ دھمکیاں دیتے تھے اور ڈنڈے برساتے تھے۔ بلکہ وہ بندوقیں تان کر اُن خواتین پر گولی بھی چلاتے تھے، جو ذرا دُور ہوتی تھیں۔ لیکن خودکشی کی خواہش میں اس قدر شدت تھی کہ وہ کسی کے درد، رحم یا احساس کا اظہار کیے بغیر موت کی آغوش میں چلی جاتی تھیں۔

اگرچہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اُس روز کتنی خواتین اور کتنے بچوں نے اپنی زندگی دریا بُرد کی ہوگی۔ تاہم میرے علاوہ تین اور خواتین جو میرے ہی کمرے میں تھیں، نے اپنے آپ کو مرنے نہیں دیا۔

میں نے اپنے بارہ سالہ بچے ویمل کو دریا کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس لیے میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک دیا۔

"ماں" اُس نے کہا "مجھے جانے دو۔ کیا مجھے جانے دوگی؟ میں مرنا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ میری بہنوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہوگی، مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے پیچھے کھینچ لیا۔ "آپ بزدل ہیں۔" اُس نے کہا۔ "آپ ایک شرمناک موت مرنا چاہتی ہیں اور آپ اس صورتِ حال سے باہر نکلنے کے لیے اپنی چھوٹی اُنگلی اُوپر اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ کو موت کا خوف نہیں ہونا چاہیے...... ماں! آپ کو مرنے کے لیے کوئی قابلِ قدر کام کرنا چاہیے۔"

وہ کسی قسم کی کوئی دلیل یا حجت سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب خودکشی کو حل سمجھ لیا جائے تو یہ سب کو

مفید نظر آنے لگتا ہے۔ میرے بیٹے نے بھی اس فضول حل کی فراری رُوح سے (Escapism) شناسائی حاصل کر رکھی تھی۔ ''اب کوئی غیرت مند عورت زندہ نہیں ہے.. ماں! آپ بھی میری بہنوں کو لے کر دریا میں کود کیوں نہیں جاتیں؟ مجھے اپنی تقدیر کے حوالے کر دیں۔ میں خود اپنے آپ کو قتل کر دوں گا۔''

میں نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میرے بیٹے! اتنے ضدی نہ بنو۔ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اگر میں چاہتی تو دریا میں کود سکتی تھی۔ کیا تم اپنے باپ کو بھول گئے ہو؟ جب تمہارے پاپا یہ سنیں گے تو اُن کا بُرا حال ہو جائے گا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُن کے ساتھ کیا بیتی۔ اس کے بعد میں سوچ سکتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

ایک حملہ آور ہمارے قریب سے گزر رہا تھا وہ مجھ پر آوازہ کسنے کے لیے رُکا اور بولا ''تم بھی کود کیوں نہیں جاتی؟ میں تمہیں ہرگز نہیں رُوکوں گا۔ تمہیں اِس کا یقین ہونا چاہیے؟''

''ٹھیک ہے لیکن بدقسمتی سے فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ لیکن کئی حملہ آور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اُس منظر نے جو انہوں نے ابھی ابھی دیکھا تھا اُنہیں بُری طرح متاثر کر دیا تھا۔ میں یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں نے یہ کیوں سوچا تھا کہ یہ سب میرے نجات دہندہ چار پٹھانوں سے مختلف ہیں۔ شاید پیدائشی طور پر وہ سب اچھے تھے۔ اُن کی نرم دلی کے اظہار سے حوصلہ پا کر میں نے اُنہیں بتانے کی جرأت کی ''اب آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اب پچھتانے یا افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ نے اپنے ہاتھوں کو بے گناہوں کے لہو سے رنگ دیا ہے۔ آپ کی یادوں میں یہ منظر ہمیشہ آپ کا پیچھا کرتا رہے گا۔ آپ کے اندر کبھی بھی ایسی مصفّا سوچ پیدا نہیں ہو سکے گی جو اس غلیظ یاد سے آلودہ نہ ہو۔''

دوسری عورتوں کا خیال تھا کہ شاید میں نے زیادہ دلیرانہ گفتگو کر لی ہے۔ انہوں نے مجھے سرگوشیوں کے ذریعے روکنے کی کوشش کی۔ ''اب تم چپ کر جاؤ۔ تم غیر ضروری اور بے ترتیب باتیں کر رہی ہو۔ اس سے تو ہم پر کوئی نئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔''

میں نہیں جانتی کہ کتنے حملہ آوروں نے میری ہندوستانی سمجھی ہو گی لیکن اُن میں سے ایک نے تو متاثر ہو کر کھلم کھلا اقبال جُرم کیا۔ ''آپ نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا۔ مہربانی کر کے بتاؤ کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

وہ صاحبِ اختیار معلوم ہوتا تھا۔ وہ واقعی مفید ثابت ہو سکتا تھا اور میں حیران تھی کہ کیا وہ میری بیٹیوں کی بازیافت میں میری کچھ مدد کر سکتا ہے۔ تاہم قبل اس کے کہ میں کوئی تجویز پیش کرتی۔ اُس نے کہا۔ ''یہ ایک

آدمی ہے جو آپ کو حفاظت سے جیل میں لے جا کر چھوڑے گا۔" میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بچوں کو ہمراہ لے کر شہر کی طرف چل پڑی۔ جیل ایک چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے واقع تھی۔ راستے میں ہم نے کئی گھر دیکھے جو مکمل جل چکے تھے اُن کی جھلسی ہوئی باقیات نیلے آسمان کے سامنے بھدّی اور غلیظ قطاریں بن کر کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ایک یا دو سپاہی اِدھر اُدھر مٹر گشت کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کو راستے میں روک کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے پر مجبور کرتے تھے۔

ہمارا گائیڈ بمشکل بائیس سال کا ہوا ہوگا جس سے میں نے راستے میں بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ "آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنی دُور کیوں آئے ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے فوراً جواب دیا۔ "کیونکہ پاکستان کے حکمرانوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے اور کشمیر کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مسلمان عورتوں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ یہ بالکل غلط اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈہ ہے کیونکہ اس حملے سے پہلے ریاست میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لیکن وہ جھوٹ جو کافی عرصہ سے اُس کے ذہن کو گہرائی تک متاثر کر چکا تھا، کی وجہ سے وہ اپنے موقف پر قائم رہا اور قائل نہ ہو سکا۔ "قبائلی دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتے اور وہ کشمیر میں مسلم خواتین کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اس گمراہ نوجوان کو کیسے قائل کر سکتی ہوں کہ کشمیر میں اگر کسی کو حفاظت کی ضرورت ہے تو وہ مسلمان خواتین نہیں۔

میں نے محض تجسس کے باعث اُس سے پوچھ لیا کہ "کیا تمہیں اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے؟" 'اوہ، نہیں' اُس نے کہا۔ "ابھی تک اس بارے کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ ہمیں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ہندوؤں کو قتل کریں، اپنی پسند کی لڑکیوں کو اُٹھا کر لے جائیں، کوئی بھی چیز جو ہمیں ملتی ہے اُسے لوٹ لیں اور گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ کیونکہ در حقیقت جو چیز ہمیں چاہیے وہ تو زمین ہے۔"

"تم لوگوں نے جو کچھ یہاں کیا ہے۔ یہ تمہارے اور تمہاری نسل کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں بنے گا۔ تم نے اپنے مذہب کے ہر حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔"

اُس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ یہ سچ ہے کہ بہت سے قبائلی یہاں صرف لوٹ مار کے لیے ہی آئے ہیں۔ ہم نے سُنا تھا کہ کشمیر سے بڑی مقدار میں سونا ملے گا۔ ہم نے اُن سب کو قتل کر دیا ہے۔ صرف وہی چند لوگ زندہ ہوں گے جو پہلے روز سے ہی چُھپے ہوئے ہیں۔ خواتین جو زندہ ہیں وہ یا تو بوڑھی ہیں یا زخمی۔ البتہ کچھ نوجوان عورتیں ابھی جیل میں ہیں۔"

میں نے سوچا کہ یہ تجزیہ دل شکن تو ہے، لیکن ہے درست۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ راستے میں ہمیں مقامی مسلمانوں کے گروہ ملے اُن میں سے کچھ کو ہماری حالت پر افسوس تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ ہمارے ساتھ ٹھیک ہوا ہے۔ ہم کچھ قبائلیوں سے بھی ملے جو ننگے پاؤں تھے اور اُن کا لباس بھی تار تار تھا۔ انہوں نے اپنی بندوقیں کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ اور اُن کی گولیاں مخصوص ڈبوں میں اُن کی کمر کے گرد بندھی ہوئی تھیں۔ وہ محض آوارہ گردی کر رہے تھے اور جب وہ ہنستے تھے تو اُن کی خوشی سے عاری ہنسی بہت شور پیدا کرتی تھی۔ اُن میں سے کچھ لوٹ مار کے سامان کی تقسیم پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے ہمیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ میرے بیٹے ومل اور بیٹی کملیش کی طرف انگلی اُٹھا کر چیخا ''یہ کتنے خوب صورت بچے ہیں ہم انہیں اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔''

ہمارے نگران نے اُن سے ایسی زبان میں بات کی جو میں سمجھ نہ سکی لیکن اُس آدمی نے فوراً اپنا ذہن بدل لیا اور اعلان کر دیا کہ ''ہم انہیں جیل سے بھی پکڑ لیں گے۔ جیسے جیسے ہم چلتے جاتے تھے تو وہ بچوں کو اپنی ملکیت کے طور پر دیکھ رہے تھے۔''

ہم بالآخر ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے ہم اپنے بنگلے کی دیوار دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ جل چکا تھا لیکن اب بھی جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ میں محسوس کرنے لگی کہ گھر بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور جو کچھ گزشتہ چند روز سے ہم پر گزر رہا ہے وہ کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ ہے۔ بخوشی کا ایک عارضی لمحہ تھا جب میں نے چیخ کر کہا ''وہ ہمارا گھر ہے۔''

''ایسا ہے؟ لیکن اب تو ہمارے لوگ اُس میں رہ رہے ہیں'' میرے نگران نے مجھے مطلع کیا۔ میں وہاں ذرا سا ٹھہر کر گھر کی باقیات دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ہمیں آگے دھکیل دیا گیا۔

جیل مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُن میں سے کچھ کے ہاتھوں اور ٹانگوں پر گولیاں لگی ہوئی تھی اور وہ درد سے کراہ رہے تھے۔ بچوں کو چار دن سے کھانے پینے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ کوئی اپنے بچے کے لیے رو رہا تھا اور کوئی اپنی بیوی کے لیے کسی سے اس کی بیٹی چھین لی گئی تھی اور کسی سے اُس کی بیوی۔ بہت سی نوجوان عورتوں نے حملہ آوروں کی ہوسناک نگاہوں سے بچنے کے لیے اپنے چہروں پر گوبر، مٹی اور گارا مل کر اپنی شکلیں بگاڑ رکھی تھیں۔ میری نظر شیوا دیال اور اوم پرکاش پر پڑی۔ انہیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی اور مجھے بھی۔

اکلوتا شہید

ہم ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئے۔اب وہ لمحہ جس کا مجھے کافی دیر سے انتظار تھا،آن پہنچا تھا۔میں صبر و قرار کھو رہی تھی اور میری سانس رکی ہوئی تھی۔میں نے شیوا دیال اور اُوم پرکاش سے مہتا جی کے بارے جاننا چاہا۔جیل کا سابق داروغہ بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔اس طرزِ تخاطب میں بدخبری اور نحوست کا مِلا جُلا تاثر تھا۔تاہم وہ قدرے ایک لمبی کہانی سنانے کے لیے تیار دکھائی دیتا تھا۔اُس نے کہا''ماتا جی!مجھ میں نہ تو ہمت ہے اور نہ ہی صلاحیت کہ میں اُس سارے حادثے کو مِن وعن از سرِ نو اپنے ذہن میں جگہ دے سکوں۔یہ واقعہ پہلے ہی روز کا ہے۔میں جانتا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن میں وہ سب کچھ آپ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ..... مہتا صاحب......''

میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ کہانی یہیں پر ختم کر دے۔مجھے جبّلی طور پر معلوم تھا۔میں جانتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا ہے جسے میں گزشتہ کئی دنوں سے جان بوجھ کر ماننے سے انکار کرتی رہی تھی۔مہتا جی شہید ہو چکے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل کر دور جا چکی تھی اور اب میرے لئے اندوہناک غم و دل گرفتگی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں ایک ایسی دُنیا میں تنہا ہو کر خیالات میں ڈوب گئی جہاں ذات اور بیرون ذات ایک ہو جاتے ہیں۔مجھے شرم بھی آنے لگی تھی اور درد بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اُس مقصد کے لیے جدوجہد میں حصہ لینے سے انکار کیا جس کی خاطر انہوں نے جان دی۔یہ ایسا مقصد تھا جس میں اُن کی موت کے لیے کافی جواز موجود تھا۔یہ خود غرضانہ سوچ تھی کہ میں اِس عظیم سانحہ کے موقعہ پر اُن کے شانہ بشانہ موجود نہ تھی۔اگر میں بھی اُن کے ساتھ مر جاتی تو میری موت بھی ہمیشہ کے لیے اہمیت اختیار کر لیتی۔یہ سوچ کر میرا درد لوٹ آیا لیکن اس کے ساتھ یہ ٹھوس حقیقت بھی کہ وہ دوبارہ کبھی بھی میری خوشی اور غمی میں حصہ نہیں لے سکیں گے اور بقیہ زندگی میں مجھے ہمیشہ اُن کی یاد ستاتی رہے گی......ہر وقت اور ہمیشہ......

میرا جسم درد کے مارے بالکل مختصر سا ہو کر رہ گیا اور شدت درد نے میرے اعضاء کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں خود چل کر ایک بے مقصد موت کے کنارے پر پہنچ گئی ہوں، جو بالکل بے معنی ہے اور جس کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔

لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے اپنی طاقت مجتمع کی تا کہ میں اُس سے اس واقعہ کی تفصیل معلوم کر سکوں۔ اور اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے یہ کیسے کر لیا۔

اُس نے جواب دیتے ہوئے کہا ''جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں اُدھر ہی تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ یہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ میرا خیال تھا کہ آپ یہ سُن کر کوئی جذباتی قدم اُٹھا لیں گی اور پھر بچے مکمل طور پر یتیم ہو جائیں گے۔ اگر میں نے یہ خبر اُس وقت، آپ تک پہنچا دی ہوتی تو آپ یہ چھوٹے چھوٹے کام جو اِس وقت کر رہی ہیں، نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے کسی بھی طرح وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔''

میں اِس سے زیادہ برداشت نہ کر سکی اور آہیں بھرنے اور سسکیاں لینے پر مجبور ہو گئی........ ''اوم! تم نے یہ بات مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھی؟ انہوں نے اپنی زندگی اپنے وطن پر نچھاور کی ہے اور میں نے کیا کیا ....؟ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اُنہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ اگر تم نے مجھے یہ سب کچھ پہلے بتا دیا ہوتا تو میں بچوں کو لے کر بنگلے پر چلی جاتی اور ہم سب آخر دم تک اکٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں زیادہ مطمئن ہوتی۔

اُوم نے سوچا کہ میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی اس۔ لیے وہ میرے بارے زیادہ فکرمند ہو گیا۔ اب داروغہ نے وہ کہانی وہیں سے شروع کی ''ہر شخص وزیر صاحب کی شہادت سے متعلق احترام کے ساتھ بات کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وزیر صاحب نے انتہائی دلیری سے، اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان دی ہے۔ اُوم اِس بات کی تصدیق کرے گا۔''

اُس کا خیال تھا کہ اِس بات سے کہ میرے شوہر کو لوگ احترام سے یاد کر رہے ہیں، میرا غم غلط ہو جائے گا۔ اس لیے اُس نے تفصیل سے ساری کہانی بیان کی۔ ''وزیر صاحب اپنے بنگلے سے نکل کر ھائی سکول چلے گئے۔ ان کے ہمراہ سپرینٹنڈنٹ پولیس، سب انسپکٹر اور پولیس کے سپاہی تیئس (23) تھے۔ چند روز پہلے سکول کے صحن میں ایک توپ نصب کی گئی تھی اور اُس پر نو سپاہیوں کی ڈیوٹی تھی تا کہ حملہ آوروں کو بھگایا جا سکے۔ لیکن سپاہی بھاگ گئے تھے۔ ہر آدمی نے مہتا جی کو متنبہ کیا کہ وہ سکول کے صحن میں نہ جائیں۔ لیکن انہوں

نے کسی کی نہ مانی۔ وہ اندر گئے اور یہ دیکھ کر غصے میں آ گئے کہ اِس جگہ کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ خود سپاہیوں کی مدد سے اُس جگہ کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ مقامی مسلمانوں نے بھی اُنہیں روکنے کی کوشش کی۔ ''ہم سب آپ کا احترام کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ آپ اس طرح اپنی زندگی ضائع کریں۔ آپ تنہا سب کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی آئے ہوئے ہیں۔'' لیکن اس سے اُلٹا مہتا جی ناراض ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''دیکھو۔ آپ کا ملک خطرے میں ہے۔ آپ کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس آپ مجھے بھی جا کر چھپ جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آیئے اور آ کر میری مدد کیجئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سکول کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کی مدد کریں۔'' لیکن اُن کی مدد کے لیے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ بلکہ وہ سارے ایک ایک کر کے خاموشی سے نکل گئے۔ سپاہی اور ایک دو دوسرے لوگ جنہوں نے مدد کی پیشکش کی بہت کم تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے مہتا جی نے مایوس ہو کر پھر اُن پر بھروسہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''میں نے کسی قسم کا دفاع بنانے کی پوری کوشش کی لیکن آپ میں سے کوئی بھی اپنی سماجی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا۔ آپ اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے بارے سوچتے تک نہیں۔ اگر آپ یہاں فرائض ادا کرنے میں میری مدد نہیں کریں گے تو میں گھر چلا جاؤں گا۔ میرا یہ فرض بھی ہے کہ میں اِس مصیبت میں اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کروں۔''

لوگوں نے پھر انہیں متنبہ کیا کہ وہ نہ جائیں کیونکہ حملہ آور اُن کے گھر میں داخل ہو چکے ہیں اور اُس پر اُن کا قبضہ ہے۔ مہتا جی نے اُن کی تنبیہ کو نظر انداز کر دیا اور فوراً اپنے بنگلے پر پہنچ گئے۔ پولیس کا سب انسپکٹر جو اُن کے ہمراہ تھا وہ ایک راجپوت تھا لیکن اُن کے ساتھ اندر نہیں گیا بلکہ باہر دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ مہتا جی سیدھے گھر کے اندر چلے گئے۔ اس کے بعد کی بات اُوم کو بتانی چاہیے کیونکہ باقی کہانی وہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔

اُوم چیخ رہا تھا اور اُس کی آواز میں گھٹن اور لڑکھڑاہٹ تھی۔ ''میں غسل خانے میں چھپا ہوا تھا جب مہتا صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں اُنہیں غسل خانے کی کھڑکی کے شیشوں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا ''ماتا جی کہاں ہے؟'' میں پاگلوں کے انداز میں اشاروں سے درگاہ کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ باہر کھڑا سب انسپکٹر میرے اشاروں کا مفہوم سمجھ گیا لیکن اُس نے اندر آنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ مہتا جی مایوس ہو گئے اور ناراض بھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''وہ اِس طرح کیوں بھاگ گئی؟ اُسے یہیں رُک کر صورتِ حال کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ میں اِس اُمید پر واپس آیا تھا کہ ہم سب اکٹھے ہو کر بہادروں کی موت مریں گے۔'' تاہم میں نے آپ کے حق میں کچھ کہنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ میں نے صرف اُن کی منت سماجت کی کہ وہ

یہاں سے چلے جائیں۔تقریباً ساٹھ حملہ آور اُس وقت گھر میں موجود تھے۔میں نے انہیں متنبہ کیا لیکن انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کریں گے اور کسی بھی صورت پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

اُوم اپنی بات مزید جاری نہ رکھ سکا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔''اُوم! مت رؤو........وہ جانتے تھے کہ بہادری سے جان کا نذرانہ پیش کیے جانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔میں بزدل تھی کہ وہاں سے بھاگ نکلی۔بمہربانی اپنی بات جاری رکھو اور مجھے ساری کہانی سُناؤ۔''

اُوم نے ہمت باندھی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔''قبائلیوں کو پتا چل گیا تھا کہ مہتا جی گھر واپس آگئے ہیں۔اُن سب نے اپنی رائفلیں اُن پر تان لیں اور چلاّ کر کہا۔''کافر! تم گھٹنوں کے بل جُھک کر ہمیں سجدہ کرو،ہم پاکستان کے نمائندے ہیں۔یہ ہیٹ (Hat) اُتارلو۔''مہتا جی نے کوئی بات نہیں کی اور خاموش کھڑے رہے''ہمیں بتاؤ کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟''انہوں نے پوچھا۔مہتا جی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔اسی اثناء میں ایک مقامی مسلمان بھی وہاں آگیا اور اُس نے مہتا جی کی منت سماجت کی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں،آپ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھول کر اپنی زندگی کیسے گنوا سکتے ہیں؟ اور پھر آپ کو ایسا ظاہر کرنے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔''

قبائلی بے قرار ہوئے جا رہے تھے۔''ہم ایک مرتبہ پھر پوچھتے ہیں،تم ہندو ہو یا مسلمان؟''اس مرتبہ وزیر صاحب نے جواب دیا اور زور دیتے ہوئے کہا''میں ہندو ہوں،مسلمان نہیں ہوں''۔اس جواب نے حملہ آوروں کو انتہائی مشتعل کر دیا۔اُن سب نے یکے بعد دیگرے اُن پر فائر کیے۔وہ اُس وقت تک سیدھے کھڑے رہے جب تک انہیں چار گولیاں لگیں۔پھر وہ گر گئے۔اُس وقت تک اپنی کمزور آواز میں''رام رام'' کا ورد کرتے رہے جب تک اُن کے جسم سے رُوح پرواز نہ کر گئی۔میں آخر تک وہیں رہا اور اُس کے بعد بھاگ کر آپ کی طرف آگیا۔اگرچہ وزیر صاحب نے انتہائی بہادری کا ثبوت دیا لیکن یہ سارا منظر انتہائی الم ناک تھا۔میں اب تک اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکا۔''

میں نے شیوا دیال سے پوچھا''میّت کے ساتھ کیا ہوا؟''اس نے کہا''میرے دوست رام چرت کو وزیر صاحب کی میّت اُس راستے پر پڑی ہوئی نظر آئی جو آپ کے گھر کی طرف جاتا تھا۔عین اُسی وقت ایک مسلمان ہمسایہ وہاں سے گزر رہا تھا۔وہ دونوں مل کر میّت کو آپ کے بیڈ روم میں لے گئے۔ان کے جوتے اُتارے۔جب بنگلے کو آگ لگائی گئی تو میت اُس وقت وہیں تھیں،اس لیے وہ جل گئی ہوگی۔جب قبائلی مہتا جی کو

قتل کر کے واپس لوٹے تو ایک مقامی مسلمان اُن کو ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے سُن رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے'' یہ شخص جسے ابھی ابھی ہم نے گولی ماری ہے، بے حد دلیر آدمی تھا۔ ہم اس واقعہ کو کافی عرصہ تک بھول نہ سکیں گے۔ دراصل اس کے بارے حکم تو یہ تھا کہ اسے زندہ گرفتار کریں لیکن یہ اتنا ضدی تھا کہ ہم نے غصّے میں آکر اسے گولی ماردی۔'' میں نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔'' کیا انہیں یقین تھا کہ وُہ وزیر (ڈپٹی کمشنر) تھا؟''

'' بالکل۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وزیر تھا اور یہ گھر بھی اُس کا تھا۔ وہ صرف یہ سب کچھ اُن سے کہلوانا چاہتے تھے۔''

آنسوں میرے رخساروں سے نیچے ڈھلک رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا۔'' مجھے فخر ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ثابت قدم رہے۔ وہ ایک دیانتدار اور کھرے آدمی تھے اور اس کردار کو انہوں نے مرتے وقت تک نبھایا۔ وہ ممکنہ حد تک اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد میں اپنے بچوں کی طرف مُڑی اور ان سے کہا۔'' بچو! تم نے خود سُن لیا ہے کہ تمہارے بابا نے کس بہادری کے ساتھ موت قبول کی ہے جو تمہارے لیے ایک سبق ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو تم بھی فرض کے ساتھ لگن کی اس مثال کو اپنا لو۔ تم خوش نصیب اولاد ہو۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک بہادر ہستی تھی۔''

ہم سب نے خاموشی کے ساتھ یہ عہد کیا کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے اُن کی شہادت کی رُوح مجروح ہوتی ہو یا اُن کی روح کو دُکھ پہنچے۔ میں نہیں سمجھتی کہ بچوں نے وہ ساری بات یاد کر لی ہو گی جو میں خود اُنہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں خود غم واندوہ اور مدح وتوصیف کے جذبات سے مغلوب تھی۔ اور جو کچھ میں نے کہا وہ اس طرح تھا جیسے کوئی خبطی بول رہا ہو۔

میرے رنج وغم کی دیوانگی بتدریج کم ہوتی گئی۔ میں اُن کی قربانی کی عظمت سے بے حد متاثر تھی بلکہ یہ تصوّر کسی حد تک میرے لیے باعثِ تشفی بھی تھا۔ اب میں نے اپنی بیٹیوں کے بارے سوچنا شروع کیا تو میری تشویش میں پھر اضافہ ہو گیا۔

ایک نتیجہ خیز انٹرویو

تیسرے روز ہمیں تھوڑی سی روٹی اور کچھ گوشت کھانے کو دیئے گئے۔ کچھ لوگ خوش تھے کہ آخر کھانے کو کچھ تو ملا۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے حملہ آوروں سے کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے وہ پڑوس کے کھیتوں میں چلے گئے اور وہاں سے گنے لے کر آ گئے۔ فصل پکی ہوئی تھی اور کٹنے کے لیے تیار تھی۔ طویل مصائب نے انہیں جزوی طور پر بے حس کر دیا تھا اور وہ اس قدر بھوکے تھے کہ انہیں اخلاقیات کے کسی سبق کی پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے گنے کے ٹانڈے کاٹے اور انہیں چبانے لگے لیکن ساتھ ہی بے بس بچوں کی طرح پُھوٹ پُھوٹ کر روتے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کے بعد ہمیں باقاعدہ راشن ملا کرے گا۔ جب بھی دوسری خواتین میں کسی قسم کی کوئی حرکت نظر آتی تھی اور وہ خفیہ طور پر خوف زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی تھیں تو میں اپنی بیٹیوں کے خیال میں غرق ہو جاتی تھی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اِس گومگو کی وجہ کیا ہے تو معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا روز مرہ کا معمول بن گیا ہے کہ وہ جیل کے سیلز میں داخل ہو جاتے ہیں، خواتین کا جائزہ لیتے ہیں اور انہیں اپنے لیے خود منتخب کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ رات کے پچھلے پہر آتے ہیں اور منتخب کردہ خواتین کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اگر اِن خواتین کی گود میں بچے ہوں تو انہیں چھین کر زمین پر پٹک دیتے ہیں اور اُن کی ماؤں کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تین دن تک یوں ہی ہوتا رہا۔ بہت سی خواتین اس بدنامی کو برداشت نہ کر سکیں تو اُنہوں نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ خواتین نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر اُن کے ٹکڑے کھا کر اپنی زندگیاں ختم کیں۔ لیکن موت بھی انہیں آسانی سے آزادی نہیں دیتی تھیں کہ اُن کو مہلک اور دردناک عذاب میں دیکھنے کا منظر بے حد دل شکن اور اذیّت ناک تھا۔ اُن کے باپوں اور شوہروں کے لیے بھی آہستہ آہستہ بے رحم موت مرنے کے اِس عمل کا منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ اِس لیے جب وارڈرز دیکھ نہیں رہے ہوتے تھے تو وہ جیل سے نکل کر اپنے پیاروں کو دریا میں پھینکتے تھے تاکہ اُن کا دُکھ اور درد بھی ساتھ ہی ڈوب جائے۔ اس کے باوجود حملہ آوروں نے دریا سے بھی کئی عورتوں کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور خودکشی کے ذریعے اُن کی

اپنی حفاظت کی کوشش بھی ناکام بنادی گئی۔

حملہ آوراس پر راضی ہوگئے تھے کہ ہم میں سے کچھ مرداُن کے ساتھ جائیں اور ہمارے لیے راشن لے کر آئیں۔شیوادیال نے کچھ گنے اور مکئی اکٹھی کر لی تھی۔بچوں نے یہ بہت رغبت سے کھائی انہوں نے گزشتہ دو روز سے فی الواقع کچھ بھی نہیں کھایا تھا لیکن مجھے بھوک محسوس نہیں ہورہی تھی۔یوں لگتا تھا کہ جب رنج وغم انسان کی زندگی میں زندہ رہنے کے لیے جواز کی حیثیت اختیار کرلے اوراُس پر چھا جائے تو محض غذا اُسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے شوہر کی موت کو بہادری سے برداشت کروں لیکن اُن کی جدائی کا غم مسلسل میرے انگ انگ کو کاٹ کرکھائے جارہا تھا۔کیونکہ میری زندگی کا واحد جواز وہی تھے جو ختم ہوگیا تھا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک احساسِ جرم کہ شاید میرے شوہر نے آخری وقت میں مجھے بزدل اور بھگوڑا سمجھا ہو،میرے لیے اذیّت ناک ثابت ہورہا تھا۔اگر کبھی خواب میں بھی آکرانہوں نے مجھے کہہ دیا ہوتا کہ میں نے بچوں کی خاطر گھر چھوڑ کراچھا کیا تو میں اِسے معافی کا سرٹیفکیٹ سمجھ کر مطمئن ہوسکتی تھی۔اگر میں قائل ہوسکتی کہ میرے شوہر نے اپنے آخری لمحات میں مجھے بزدل نہیں سمجھا تو پھر بھی میں اپنا سر وقار اور فخر سے بلند رکھ سکتی تھی اور شاید پھر میں اُن کی قُربانی کے مفہوم کے ذریعے مزید اہمیت بھی حاصل کرسکتی تھی۔بزدلی اور آنسو تو اُن کی یاد کے لیے پھولوں کے ہار ثابت نہیں ہوسکتے۔میں نے محسوس کیا کہ اب میرا فرض صرف یہ ہے کہ میں اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کروں اور انہیں خوش رکھوں۔تاکہ وہ شرم اور شکست کے احساسات سے مغلوب نہ ہوجائیں۔

جیل میں ہمیں چند ہی گھنٹے گزرے ہوں گے جب ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''میرا نام چمن لال ہے۔وزیر صاحب اور میں اچھے دوست تھے۔یہ خُدا کی مرضی تھی کہ وہ اُس کے کسی بڑے مقصد کو پورا کریں۔میں آپ کے پاس پاکستان کے ایک چیف، جو اِس وقت آپ کے بنگلے میں ہے، کا پیغام لے کر آیا ہوں۔مظفر آباد کا سارا انتظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔دراصل اُس کا بھائی بھی میرے ساتھ آیا ہے جو باہر انتظار کررہا ہے۔وہ آپ کو حفاظت سے وہاں پہنچادے گا۔''

میرا سارا جسم لرز اُٹھا اور مجھ پر خوف طاری ہوگیا کہ شاید اب بدترین ہونے والا ہے۔مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا جو یہ سوچا کہ شاید میں بچ جاؤں۔اب میرے پاس بھی وہی چارہ کار تھا جس کے ذریعے بہت سی خواتین پہلے ہی اپنی جان دے چکی تھیں۔اب موت کے ذریعے آزادی حاصل کرنے اور بے

عزتی اور آبروریزی برداشت کرنے، جو زندہ رہنے کے لیے حملہ آوروں کا مطالبہ تھا، کے درمیان انتخاب کا وقت آن پہنچا تھا۔ موت دوسروں کی طرح میرے لیے بھی نسبتاً آسان حل تھا۔

میں نے اپنے بالوں سے سُرخ ڈوری کا ایک ٹکڑا کھولا جو میری شادی کے وقت میرے سسرال نے میرے بالوں میں باندھا تھا۔ یہ ایک مقدّس نشانی بھی تھی اور ماضی کی علامت بھی۔ جس پر میں طاقت کے حصول کے لیے اب بھی انحصار کرتی تھی۔ کسی کو دکھائے بغیر کہ میں کیا کر رہی ہوں، میں نے پوری طاقت سے اپنے گلے کو اُس سُرخ ڈوری سے باندھا اور کچھ وقت کے لیے بے ہوش سی ہو گئی اور ہوش میں اُس وقت آئی جب دیکھا کہ اُوم پرکاش اور چمن لال مجھ پر جھکے ہوئے ہیں اور اُن کے چہرے پر تفکر کے آثار ہیں۔ انہوں نے میرے چہرے پر پانی چھڑکا تاکہ میں ہوش میں آجاؤں اور پھر میرے گلے کے اردگرد ڈوری کی گانٹھ ڈھیلی کر کے اس کو نکال دیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ کیوں نہ میں اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے صورتِ حال کا مقابلہ کروں؟ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے شوہر کی شایانِ شان بن کر دِکھانے کی ضرورت ہے۔ آخر کار میرے اندر اب بھی خفتہ قوت کے ذخائر موجود ہوں گے جنہیں سامنے لا کر استعمال کرنا ضروری ہے۔ اپنے آپ کو نیکوکار ثابت کرنے کے زعم کو ہمیشہ قابلِ نفرت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی تو یہ سوچ بھی ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ سیدھے سادے عقیدے کی پیروی میں اطمینانِ قلب تلاش کرتے ہیں بسا اوقات وہ بھی ناقابلِ برداشت حد تک نیکی اور پارسائی کے دعوے دار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مجھے ایک حادثہ یاد آگیا جو اُس وقت رُونما ہوا تھا جب میرے شوہر ابھی بقیدِ حیات تھے۔ میں نے ایک مرتبہ قدرے شیخی بگھارتے ہوئے اور بڑی سنجیدگی سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر کوئی عورت اپنے عقیدے اور نظم وضبط کے معاملے میں مضبوط اور سخت گیر ہو تو وہ ہزاروں مردوں کو مدح اور توصیف کے ساتھ ساتھ اپنی قربان گاہ پر عبادت کے لیے بھی مجبور کر سکتی ہے۔ میرے شوہر نے میرے اس دعوے کو ہنسی میں اُڑا دیا تھا۔ یہاں ابھی اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کا وقت آ گیا تھا اور اگر میں نے مجروح ہوئے بغیر صورتِ حال کا مقابلہ کر لیا تو شاید مجھے اپنے شوہر کی روح کے سامنے احساسِ جُرم کی ضرورت نہ رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پاکستانی چیف کو ملنے کے لیے ضرور جاؤں گی۔

میں نے چمن لال سے پوچھا۔ ''وہ آدمی کہاں ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا؟ اُسے اندر لے آؤ۔'' میرا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ میں نے ابھی ابھی خودکشی کی جو کوشش کی تھی اُس کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔ میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو آنے والے غیر یقینی مقدر کے سفر کے لیے تیار کر رہی تھی۔

اتنے میں چمن لال دو آدمیوں کو لے کر اندر داخل ہوا۔ انہوں نے مجھے شاہانہ طریقے سے سلیوٹ کیا اور کہا ''ہمارے چیف نے ہمیں آپ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔'' میں نے صرف اس شرط پر اُن کے ساتھ جانے پر اتفاق کیا کہ میرے بچے اور ملازم بھی میرے ساتھ جائیں گے۔ اس طرح ہم واپس اپنے تباہ شدہ گھر کی طرف جانے کے لیے روانہ ہوئے، جہاں کل تک ہم کسی قسم کے رنج و غم سے واقف نہ تھے وہ راستہ جس پر کبھی ہم لاپرواہی اور سست روی سے چلا کرتے تھے آج ہم اُس پر چیتھڑوں میں ملبوس ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ میں اپنے مقدّر کے تیز تر اُتار چڑھاؤ کے تصوّر میں قدرے فرحت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

ہمارے بنگلے میں زیادہ کچھ بچا ہوا نہیں تھا۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی جلی ہوئی باقیات کا وسیع اور ہولناک میدان نظر آ رہا تھا۔ حملہ آوروں کی آگ سے صرف باورچی خانہ اور مہمان خانے کے کمرے بچے ہوئے تھے۔ مکان کی جگہ مسلح حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے چیف کے پاس لے جایا گیا جو اس وقت حملہ آوروں کے ایک گروہ کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ وہ بھی ایک قبائلی تھا اور لگ بھگ پچاس سال کی عمر کا ہوا ہوگا۔ اس نے شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ بندوق اُس کے کندھوں پر لٹک رہی تھی۔ اور اُس کی کمر کے اردگرد ایک پیٹی کے ساتھ گولیوں کا بکس منسلک تھا۔ یہ تمام تفاصیل جاننے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ میں نے شائستگی سے اُسے سلام کیا اور کہا ''برائے مہربانی ایک غریب خاتون کا سلام قبول کریں۔''

اُس نے کچھ بھی کہنے سے قبل مجھے کڑی نظروں سے دیکھا ''آپ کو میرے ساتھ یوں شائستہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے وزیر صاحب کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ شیر دل آدمی تھا۔'' مجھے اس کی گفتگو کے دوران مداخلت کر کے یہ کہتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی۔ ''خان صاحب! آپ کو اُن کی موت پر افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ بزدل نہیں تھے، نہ خوف کے مارے انہوں نے اپنا مذہب چھپایا اور نہ ہی اپنے فرض میں کوتاہی کی۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو اُن کی موت پر افسوس کرنا مناسب ہو سکتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایسے شخص کی بیوی ہونے پر خوش نصیب سمجھتی ہوں کیونکہ وہ فی الواقع بڑے آدمی تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے بھی اُن کی قائم کی ہوئی روایت کو برقرار رکھیں۔ مجھے صرف اس ایک بات ہی سے بہت خوشی ہوگی، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے بیٹے بھی کسی ایسے موقعہ پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیں گے۔ اگر آپ نے اسلام کے نام پر ہمیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو فوراً اپنے لوگوں کو ہم پر فائر کھولنے کا حکم صادر کریں اور دیکھیں کہ میرے بچے کس بہادری سے موت کا سامنا کریں گے۔ بچوں نے بھی میری توقع کے عین مطابق کھڑے ہو کر قدم آگے بڑھا دیے۔ آنکھیں بند کیں اور خان سے کہا کہ اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ

ہمیں شوٹ کر دیں۔''

ارد گرد کھڑے سارے لوگ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میرے سامنے جو محافظ کھڑا تھا اُس نے اپنی بندوق قبور (چمڑے کی تھیلی) میں ڈال دی، بچوں کے قریب آکر اپنی بانہیں اُن کے گرد حائل کر دیں۔ خان کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں جب اُس نے کہا ''بہن جی! آپ کے بچے بہت آگے اور دُور جائیں گے۔ آپ ایک ایسی ماں ہیں جس پر ہر شخص رشک کرے گا کہ آپ کے معصوم بچے اس قدر بے خوف ہیں۔ میں نے گزشتہ چار دنوں میں کسی ایک کو بھی بے خوفی سے اپنا سامنا کرتے ہوئے نہیں پایا۔''

وہ مجھے اپنے نیک عزائم کے بارے یقین دلانا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا ''آپ اب بھی ہمارے لیے اسی طرح وزیرنی کی حیثیت رکھتی ہیں جس طرح آپ اپنے شوہر کی موجودگی میں تھیں۔ ہم سب آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے آپ کو آرام دہ بنائیں اور ساتھ ہی میں یہ بھی کروں گا کہ آپ کی بیٹیوں کو واپس آپ کے پاس پہنچاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ مقامی مسلمانوں کا ایک خاندان جو قریب ہی رہتا ہے، وہ اُس کے پاس ہیں۔ میرا ایک آدمی معمول کی گشت کے دوران وہاں گیا تھا۔ وہاں اُسے نوجوان لڑکیاں نظر آئیں جنھوں نے اُسے بتایا کہ وہ وزیر صاحب کی بیٹیاں ہیں۔ اُنہیں دو قبائلی لے کر آئے تھے جنھوں نے ایک مسلمان خاندان کو اُن لڑکیوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کہا تھا۔ میرے آدمی نے لڑکیوں سے پوچھا کہ کیا وہ قبائلیوں پر اعتماد کریں گی؟ ''ہاں، بالکل! ہم یقیناً اُن پر اعتماد کریں گی۔'' آپ کی بیٹیوں کا جواب تھا۔ اُنہوں نے کہا ''ہمارا اس گھر میں بہت خیال رکھا گیا ہے۔ قبائلی دراصل اس سے قبل ہمیں دو اور گھروں میں لے گئے تھے۔ لیکن جب اُنہیں معلوم ہوا کہ حملہ آور اکثر اِن گھروں میں آتے رہتے ہیں اس لیے وہ ہمیں یہاں لے کر آ گئے''۔

درحقیقت انہیں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ جیل میں ہیں اور یہ اُن کی صحیح صحیح اور خوبصورت وضاحت سے ممکن ہوا کہ میرا آدمی آپ کو جیل میں شناخت کر سکا۔ اس کے علاوہ آپ کی بیٹیوں نے اُس وقت تک میرے آدمیوں کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا جب تک آپ انہیں اجازت نہ دیں۔ کیا آپ میرے آدمی کو کسی قسم کی کوئی نشانی دینا پسند کریں گی جس سے انہیں معلوم ہو سکے کہ آپ یہاں ہیں؟۔ میرے آدمی انہیں یہاں آپ کے پاس لے آئیں گے۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور ایک آدمی میری بیٹیوں کو لینے کے لیے چلا گیا۔

تباہ شدہ گھر میں

ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔ بلکہ اُس ملبے پر جو کبھی ہمارا گھر ہوا کرتا تھا۔ میں بمشکل چل سکتی تھی۔ تاہم سب سے پہلے اُس بیڈروم میں گئی جہاں میرے شوہر کو گولی ماری گئی تھی۔ اُن کی میّت اُس آگ کی نذر ہوئی جس نے بنگلے کو بھی خاکستر کر دیا تھا۔ اُن کے جسم میں سے جو کچھ باقی بچا تھا وہ راکھ تھی جو سارے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔ راکھ کے یہ ذرّے مجھے یاد دلانے کے لیے کافی تھے کہ اُن کی موت حقیقت بن چکی ہے۔ اُس وقت تک تو میں لاشعوری طور پر اس تصوّر کی مزاحمت کرتی رہی تھی لیکن جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا۔ اُن کی لمبی اور خوبصورت شخصیت کا ہیولا اور مختلف اور متنوع حالات میں اُن کا رنگین تازہ دم چہرہ اچانک چمک کی طرح میرے ذہن میں گھوم گیا اور پھر کوئی چیز مجھے اندر سے کاٹنے لگی اور مکمل تاریکی چھا گئی۔

میں تنہائی محسوس کرنے لگی۔ ایسے میں میرا غم مجھے پچکار کر آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ عجیب سی بات تھی۔ وہ رُکاوٹیں جو آدمی کے برتاؤ کو عام طور پر قابلِ قبول بنا دیتی ہیں اچانک پیچھے ہٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے ایک مختلف دنیا میں اپنے وقتی اور عارضی وجود کا شدت سے احساس تھا، جس کے ساتھ احساس اور اظہار کے کچھ دیگر نمونے بھی وابستہ تھے۔ دوسروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ لوگ جو میرے اردگرد تھے شاید مجھے عجیب سمجھتے تھے اور اسی لیے جب میں نے بات کی تو وہ مجھے تجسّس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے قبائلیوں کو بتایا کہ چونکہ میں اپنے شوہر کے لیے آخری رسومات ادا کرنے لگی ہوں اس لیے وہ میرے اس عمل میں حائل نہ ہوں۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ راکھ آپ کے شوہر ہی کی ہے؟ ہم نے ایک خاکروب کو اُس کی باقیات کی جگہ کی صفائی کے لیے کہا تھا۔'' ایک شریر آواز نے مذاقاً کہا۔

لیکن میں جانتی تھی۔ ایک جانی پہچانی خوشبو اب بھی کمرے میں اُن کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ میں نے اپنے دوپٹے سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور اُن کی راکھ کو فرش سے اکٹھا کر کے اُس میں ڈال دیا۔ جب

میں راکھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باہر آئی تو میں نے اپنی بیٹیوں کو خان کے ساتھ اندر آتے ہوئے دیکھا۔ انہیں دوبارہ پا کر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن غم واندوہ نے مجھے شکستہ دل اور دیوانہ کر دیا تھا۔ میں اُن پر چلائی

''بزدلو! تم اپنی زندگی کو اپنی عزت سے زیادہ اہمیت دیتی ہو جبکہ میں نے تمہیں بتایا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔''

وہ اس طرح کے عجیب 'استقبال' کی توقع نہیں رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ماں! ہم نے یقیناً وہی کیا ہوتا جو آپ نے بتایا تھا، اگر یہ ضروری ہوتا تو۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ یہ ضروری نہیں تھا؟''

وہ آدمی بھی جو انہیں لینے گیا تھا، مجھے یقین دلانے لگا اور کہنے لگا کہ ''میڈم! آپ کی بیٹیاں اس سلوک کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ بڑی باہمت ہیں۔ پہلی مرتبہ جب خان کے حکم کے تحت میں انہیں لینے گیا تو انہوں نے اُس وقت تک میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا جب تک آپ خود انہیں آنے کا حکم نہ کریں۔

بیٹیوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''پاپا کہاں ہیں؟'' میں نے اُنہیں راکھ دکھائی۔ میں جانتی تھی کہ میں اُن کے ساتھ بہت ظلم کر رہی ہوں لیکن میں غم کے مارے بدحواس ہو چکی تھی اس لیے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کر سکی کہ یہ خبر اُن پر کیا ستم ڈھائے گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور اُن کے آنسوؤں نے مجھے قدرے خاموش اور پر سکون کر دیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ اُن کے باپ نے بڑی بہادری سے جان کی بازی لگائی اور اپنی زندگی سچائی کے لیے قربان کر دی۔ اُنہیں بھی بہادری کا ثبوت دینا چاہیے اور اُن لوگوں کے سامنے چیخ وپکار نہیں کرنی چاہیے جنہوں نے اُنہیں قتل کیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ حرکت کبھی پسند نہ کرتے۔ اُنہوں نے اپنی سسکیوں کو مدھم تو کر لیا لیکن ننھی سویدش اس قدر دل گرفتہ تھی کہ اُسے خاموش کرنا بہت مشکل تھا۔

میں راکھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر صحن میں بیٹھ گئی۔ میں نے راکھ کا بنڈل اپنی جھولی میں رکھ لیا اور ہاتھ باندھ کر طاقت اور جرات کے لیے دُعا کرنے لگی تا کہ میں اپنے زیاں کو برداشت کر سکوں اور اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک اپنے فرض کو نبھا سکوں۔ بچے اور قبائلی میرے پاس کھڑے ہو کر خاموشی سے سُننے لگے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ جب میں نے دُعا ختم کی تو خان نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ہمارے لیے تین کمرے خالی کر دیں۔ ساتھ ہی وہ باورچی خانے سے کچھ برتن بھی لے کر آئے تا کہ ہم وہ راشن پکا سکیں جو انہوں نے ہمیں دیا تھا۔

مجھے ساتھی چاہیے تھا۔ میں کسی قریبی دوست کی موجودگی اور خاموش افہام و تفہیم (Understanding) کی خواہشمند تھی، جو میری ذات کے نہاں خانوں تک اُتر سکے۔ مجھے سنت رام مودی کی یاد آ رہی تھی جسے میں اپنے بچپن سے ''ماسی جی'' کے نام سے جانتی تھی۔ وہ انتہائی مہربان اور شریف النفس

خاتون تھی۔اس لیے میں نے خان سے درخواست کی کہ اُسے میری خاطر جیل سے لانے کی اجازت دی جائے۔خان کافی مہربان تھا اور جلد ہی ''ماسی جی'' کو ایک چارپائی پر اُٹھا کر گھر کے اندر لایا گیا۔کملا جو مودی جی کے دفتر کے ایک کلرک کی بیٹی تھی، بھی اُس کے ساتھ تھی۔لیکن ماسی جی کے کپڑے خون سے لت پت تھے اور وہ بمشکل سانس لے رہی تھی۔

میں دوڑ کر چارپائی کے پاس گئی تاکہ اُس کا استقبال کروں۔اُس کے معدے میں گولی لگی ہوئی تھی اور خون اب بھی اُس کے زخم سے باہر آ رہا تھا۔اُسے شدید کھانسی اور بلغم کا عارضہ بھی تھا۔میں نے اُس کے شوہر، اُس کے بیٹے اور کملا کے بارے پوچھا۔وہ درد کے مارے بڑی مشکل سے بول سکی اور اُس کی حالت نے مجھے نیست و نابود کرنے والی ابدیّت کی یاد دلائی۔''کملا کا باپ مارا جا چکا تھا۔'' اُس نے کہا۔''وہ کشمیری پنڈت تھا۔'' دوسروں کے بارے اُس کے پاس کوئی یقینی اطلاع نہیں تھی۔ماسی جی ہمارے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی اور اس طرح اب ہماری تعداد بارہ ہو گئی تھی، جن میں سات بچے اور پانچ بڑے تھے۔تمام بچے بہت بھوکے تھے اس لیے میں نے اُوم سے کہا کہ وہ کھانا تیار کرنے کا اہتمام کرے۔جب کھانا تیار ہو گیا تو بچوں نے گزشتہ چار دنوں کے بعد پہلی مرتبہ جی بھر کر کھانا کھایا۔مسز مودی اور میں نے کچھ نہ کھایا کیونکہ ہم کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔

خان نے اپنا عملہ ڈاکٹر کے بنگلے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔سپاہی اور قبائلی باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے کی غرض سے وہیں رہ گئے۔جانے سے پہلے خان میرے دروازے پر آیا اور بلند آواز میں کہا۔''بہن جی! مہربانی کر کے مجھے ضرور بتانا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔میں نے اپنے دو آمیوں کو بتا دیا ہے کہ وہ آپ کے کمروں کی حفاظت کریں گے۔کیونکہ یہاں کی راتیں اب بھی محفوظ نہیں۔'' میں نے اُس کی تمام مہربانیوں کے لیے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

ہمارے گھر کی جھلسی ہوئی دیواروں کے تیز دھار سائے بڑھتے اور پھیلتے گئے۔ہم اب پہلے سے بہتر اور محفوظ تھے لیکن تاریکی کے ساتھ ساتھ اُداسی بھی لوٹ کر آ گئی۔بچے بہت تھکے ماندے تھے اس لیے کھانا کھانے کے فوراً بعد سو گئے۔آج دوسرے روز وہ بے غم ہو کر سوئے تھے، جب انہیں صبح کی کوئی فکر نہ تھی۔آج وہ قبائلی سردار کے مہمان کے طور پر اپنے گھر واپس لوٹے تھے جس میں اُن کے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔میں اُن کے باپ کی راکھ کو اپنی گود میں لے کر اُن کے قریب بیٹھ کر دُعا کرنے لگی کہ خُدا ہمیں مستقبل کی مشکلات برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت عطا فرمائے۔رات کے خاموش پہروں کے دوران میری نگرانی (Vigil) سورج طلوع ہونے کے بعد ختم ہوئی تو میں نے اپنے بیٹوں کو اپنے باپ کی راکھ کرشن گنگا میں بہانے کے لیے دو میل

جانے کو کہا۔

ہندو گھرانے میں یہ ایک طے شدہ رسم ہے کہ بڑا بیٹا اپنے والدین کے لیے آخری رسومات ادا کرتا ہے۔ جب بیٹا بالغ ہو جاتا ہے تو اُسے ایک متبرک دھاگہ دیا جاتا ہے جو اُسے اپنی چھاتی کے اردگرد اور بائیں کندھے کے اُوپر باندھنا ہوتا ہے جو ''اپنیانا'' کہلاتا ہے اور ایک رسم (Ceremonial) کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ اِس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اُسے ''برہمچاریہ'' کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور اُسے فرائض ادا کرنے کی رعایت مل گئی ہے۔ اُس کا سب سے پہلا اور اہم فرض اُس کی ماں کے لیے ہے، اس کے بعد ''گرو'' اور باپ کے لیے ہے۔

میں نے شیوا دیال کو کہا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ جائے لیکن فوراً ہی مجھے خیال آ گیا کہ اِن دنوں ہندوؤں کے لیے تنہا باہر نکلنا بے حد غیر محفوظ ہے۔ میں نے ویمل کو خان کے پاس بھیجا کہ وہ اُنہیں ایک محافظ دستہ عنایت کرے۔ خان نے مہربانی فرماتے ہوئے نہ صرف اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی دیا بلکہ اپنی کار بھی عنایت کی۔ میرے دونوں بیٹے، اُوم اور محافظ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر دو میل گئے اور ایک گھنٹے بعد واپس آ گئے۔

دونوں حملہ آور چیف واپس محاذ پر جا رہے تھے جب وہ مجھے الوداع کہنے آئے تو خان میرے ساتھ گویا ہوا۔ ''بہن! آپ کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم رات ہونے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔ کیا آپ ہماری کامیابی کی دُعا نہیں کریں گی؟'' میں نے کہا۔ ''جناب! میری خواہش ہو گی کہ آپ صحیح اور غلط کا فیصلہ خود کریں۔ بہرحال کسی ملک کو فتح کرنے کا یہ درست طریقہ نہیں ہے کہ آپ لوٹ مار کریں اور خواتین کی آبروریزی کریں۔ شاید آپ کا خُدا الگ ہو لیکن جو چیز فی الواقع اچھی ہے وہ کسی مذہب سے ہٹ کر بھی اچھی ہی کہلائے گی۔''

ان لوگوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ میں اس طرح کی باتیں کر کے اُن کے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہوں۔ لیکن خان میں کافی قوتِ برداشت تھی اور وہ غصہ میں آئے بغیر دلیل کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ بالکل پُرسکون اور متوازن رہا اور خاموش یقین دہانی کے ساتھ کہا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ماضی میں ہوتا رہا ہے لیکن میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔''

جنگ کے بادل

گزشتہ چار روز سے نہ تو میں نےغسل کیا تھا اور نہ ہی کپڑے تبدیل کیے تھے۔ میں اپنے آپ کو بہت بوجھل اور غیر مصفا محسوس کرتی تھی اس لیے مجھے غسل کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں صاف کپڑوں کا ایک آدھ جوڑا کہاں سے لاؤں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے کچھ کپڑے اب بھی دھوبی کے پاس ہیں۔ میں نے شیوادیال اور ایک سپاہی کو کپڑے لینے کے لیے بھیجا لیکن دھوبی نے کپڑے واپس دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ حملہ آوروں نے اُس کا گھر لوٹ لیا ہے۔ لیکن جب سپاہی نے اصرار کیا تو دھوبی نے میری ایک ساڑھی اور بلاؤز تلاش کر کے دے دیے۔ گھر میں صابن بھی نہیں تھا۔ حملہ آور سب کچھ لے جا چکے تھے۔ میں جانتی تھی کہ آٹے کا پیسٹ (Paste) صابن کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے راشن کے آٹے سے کچھ پیسٹ تیار کیا۔ مجھے سر دھونے میں بہت دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ میں اس قدر کمزور تھی کہ ٹانگوں کے بل زیادہ دیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آج پانچویں روز تو بمشکل مجھے پُورا کھانا ملا تھا۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم غیر معینہ مدت تک خان کے مہمان بن کر رہیں۔ میں نے بچوں کو اپنے پاس بُلا کر کہا۔ ''میں سوچتی ہوں کہ ہمارے لیے یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے کہ ہم کچھ کیے بغیر خان کا کھانا قبول کرتے رہیں۔ ہمیں اُس کی خیرات پر زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے میں خان سے کہوں گی کہ وہ ہم سب کو کوئی نہ کوئی کام دے۔ ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے لیکن یہ انتہائی شرم کی بات ہو گی کہ ہم دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہ کر اپنی عزت و وقار بھی ضائع کر دیں۔''

اسی اثناء میں کھانا بھی تیار ہو گیا اور جودھا جو ماسی جی کا باورچی تھا، اصرار کرنے لگا کہ میں کچھ کھا لوں۔ کچھ وقت سے اب تک میں اپنی نفی کرنے کے موڈ میں رہی ہوں۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میں کچھ نہ کچھ کھا کر اپنے غم کو غلط کر سکتی ہوں۔ کبھی کبھی یہ روّیہ نیکی کے شاندار زعم میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کسی حوالے سے اپنی

ذات کی یہ نفی مجھے صفائی اور پاکیزگی کا احساس دلانے کا باعث بھی بن جاتی تھی۔لیکن اس کے باوجود میں مزید کسی فاقہ کشی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس طرح اگر میں مزید کمزور ہوگئی تو اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گی۔ایک سمجھوتے کے تحت میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں دن میں ایک مرتبہ کھانا ضرور کھاؤں گی۔

دوپہر کے وقت کئی مقامی مسلمان ملنے کے لیے آئے۔وہ ہمدردی کا اظہار کرنے آرہے تھے۔لیکن میں نے اُن پر اپنی ناراضگی واضح کردی۔وہ مجھے یہ بتانے کے لیے بیٹھے رہے کہ وزیر صاحب نے کتنی بہادری سے اپنے فرائض انجام دیے اور بالآخر اپنی جان تک بھی دے دی۔اُن میں سے ایک نے کہا۔''اُس روز جو بدنصیبی کا دن تھا وزیر صاحب کو ہم نے بلا خوف وخطر شہر بھر میں گھومتے ہوئے دیکھا۔وہ سب سے زیادہ فکرمند اس لیے تھے کہ صحیح صحیح خبریں حکّامِ بالا تک پہنچ سکیں۔اس مقصد کے لیے انہوں نے ہمارے انتباہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔انہوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور وہ ہمارے اِن مشوروں کو کہ ''کہیں پناہ لے لیں'' محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھتے تھے۔لوگ اب بھی اُن کے بارے باتیں کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ اُنہیں ابھی تک مناسب طریقے سے خراجِ عقیدت پیش نہیں کرسکے۔''

دوسرے لوگ بھی جو اُن کے بعد آئے، اُن کی شہادت کی مدح سرائی کرتے رہے اور میں خوش تھی کہ ان میں ایک بھی آہ ایسی نہیں تھی جو خالی خولی غم کا اظہار کرتی ہو۔

قبائلیوں نے ابھی تک ہمارا بنگلہ خالی نہیں کیا تھا۔وہ مسلسل باورچی خانہ استعمال کررہے تھے اور بار بار گروہوں کی شکل میں ہماری کھڑکی کے قریب سے گزرتے تھے۔اُن میں سے کچھ تو کھڑے ہوکر کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکتے تھے اور ہم پر آوازے کستے تھے۔''ہم اپنی مشرقی پنجاب کی عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لیں گے۔''

میں اُن کے ساتھ مکالمہ کرتی تھی۔''آپ اس وقت ناراض ہیں لیکن آپ ذرا خاموشی سے لمحہ بھر کے لیے سوچتے کیوں نہیں؟ دو غلطیاں مل کر بھی ایک سچ یا صداقت نہیں بن سکتیں۔آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کسی ایسے واقعہ کی وجہ سے جو میلوں دور ہوا ہے تنگ کرکے اور دُکھ دے کر کیا حاصل کر پائیں گے؟ لیکن اُن کے پاس میرے لیے صبر وضبط نہیں تھا۔اس طرح اپنے طویل اور خالی پہروں کے ساتھ ایک اور دن بہت آہستہ آہستہ گزر سکا۔

تاریکی ہوتے ہی رات عجیب وغریب ہیولے اور شکلیں لے کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔کبھی کبھی تو وہ خوف ودہشت طاری کرنے والی تھی لیکن اکثر ڈراؤنی اور بدہیئت ہوتی تھی۔لیکن میرے لیے تاریکی میں بھی کوئی

خوف نہیں تھا کیوں کہ مجھے پہلے ہی مبہم سا احساس ہو گیا تھا کہ مستقبل حال سے زیادہ بددلی اور مایوسی کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں خوفزدہ نہیں تھی بلکہ محض شکستہ دِل اور پژمردہ موڈ کا شکار تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں رات کی تاریکی میں کسی جانے پہچانے راستے پر مگر بلا مقصد انجانی منزل کی جانب رواں دواں ہوں۔ رات کی گھڑیاں بے رحمی سے گزر رہی تھیں اور میرا ذہن بلا وجہ رات سے عبارت شکلوں اور خاکوں کے تصوّر سے بھرا ہوا تھا۔ مسز مودی جو میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی مسلسل کھانس رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پُشت سے اُس کی پیشانی کو چُھوا۔ وہ تیز بخار میں مُبتلا تھی۔

دونوں قبائلی چیف صبح صبح میرے پاس آئے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔''بہن جی! ہمارا مشورہ مانیں تو آپ ایبٹ آباد چلی جائیں اور وہیں رہائش اختیار کر لیں۔ ہم آپ کو ایک بنگلہ دے دیں گے اور آپ کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست بھی کر لیں گے۔ جب آپ کا بیٹا بڑا ہو جائے گا تو ہم اُسے وزیر بھی بنائیں گے۔''

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ میں کہیں بھی جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میں وہیں رہنا چاہتی ہوں جہاں میرے شوہر مجھے چھوڑ کر گئے ہیں۔ قبائلی سردار ذرا فیاضی کے موڈ میں تھا اس لیے میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن دیگر خواتین کے بارے تشویش کا اظہار کیا جو ابھی تک جیل میں تھیں۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ عورتوں کو جیل سے رہا کیا جا چکا ہے لیکن انہوں نے اسی شہر میں رہنے کی درخواست کی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ کافی نہیں۔ انہیں دوبارہ آباد کیا جانا چاہیے۔ وہ اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ کئی گھر تباہ ہو چکے تھے۔ میں نے خان سے کہا کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں خود جا کر ان محتاجوں کی دیکھ بھال کر سکوں۔ اس حل میں شاید ایک عنصر قراریّت کا بھی تھا لیکن اُس وقت میری سوچ بہر حال یہی تھی کہ شاید میں اِن سیکڑوں بدنصیب لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں گی۔ خان یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے بجائے اُس نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ واپسی پر وہ دونوں چیف باورچی خانے کے پاس سے گزرے اور باورچیوں کو حُکم دیا کہ جب تک ہم لوگ اس گھر میں موجود ہیں تو یہاں بڑا گوشت ہرگز نہ پکایا جائے۔

مسز مودی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور اُس کا زخم فوری توجہ کا محتاج تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو ڈاکٹر لانے کے لیے بھیجا لیکن اُسے دو کشمیری کمپاؤنڈرز مل سکے جنہوں نے بمشکل مسز مودی اور کملا کے زخموں کی ڈریسنگ کر دی۔

میرے سابق میزبان، جسے میں نے کچھ روز قبل منہ بولا بھائی بنا ڈالا تھا، کو جب معلوم ہوا کہ میں بنگلے میں واپس آ گئی ہوں تو وہ اپنے باپ کے ہمراہ مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ ہمیں مصیبت سے محفوظ دیکھ کر بہت

خوش ہوئے۔ میرے سابق مہربان نے کہا۔ ''آپ واقعی بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ کو یاد ہے جس روز آپ ہمارے ہاں تھیں تو حملہ آوروں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی اور میری بیوی کے زیورات اور سارے کپڑے لے کر چلے گئے۔ آپ کے زیورات کو انہوں نے چھوا تک نہیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُس کی حفاظت کی ہے اور کل آپ کو لا کر دے دوں گا۔

''بہت مہربانی۔ لیکن وہ میرے لیے نہ لائیں اپنے لئے رکھ لیں۔''

''نہیں، میں آپ سے نہیں لوں گا۔ کسی بھی وقت وہ آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔'' جانے سے پہلے اُس نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز زیورات لے کر آجائے گا۔

سُریش نے خان کے آدمیوں سے دوستی کر لی تھی اور اکثر اُن کے ساتھ باہر بھی چلا جاتا تھا۔

ایک روز وہ واپس گھر آیا اور مجھ سے کہا۔ ''ماں! میرا قبیلہ (Caste) کون سا ہے؟۔''

''بیٹے کیا تم یہ نہیں جانتے، ہم ویش مہاجن ہیں۔''

''ہاں، یہی میں نے بھی اُن کو بتایا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور اُن میں سے ایک کا خیال تھا کہ یہ مہاجن کوئی بہادر لوگ ہیں کیونکہ میرے باپ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُن کی گولیوں کا سامنا کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں بھی اُسی طرح بہادر بنوں گا۔ آپ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ راجپوت سب سے بہادر نسل ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''راجپوت واقعی بہت بہادر ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے دُوسرے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ایسے ایسے کام کیے ہیں جن کے لیے بے پناہ جرأت کی ضرورت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ میری گفتگو کے دوران سُریش سرگرم آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اُس سے پُوچھا۔ ''کیوں سُریش! معاملہ کیا ہے؟''

''ماں! مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے دیں، خان کا بھائی کہتا تھا کہ آپ کوئی معمولی خاتون نہیں ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی آنکھوں میں آگ ہے اور وہ اُن میں نہیں دیکھ سکا۔ لیکن مجھے تو کوئی آگ نظر نہیں آئی۔''

مجھے معلوم تھا کہ سُریش پریشان ہے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میری آنکھوں میں کچھ نہیں ہے۔ سُریش! حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ میرے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے اِس لیے ڈرتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں اپنی غلطیاں اور زیادتیاں یاد آجاتی ہیں۔ حالانکہ میری آنکھیں ویسی ہی ہیں جیسی دوسرے بے

شمار لوگوں کی۔''

قبل اس کے کہ میں اپنی بات ختم کرتی۔ تین آدمی دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور تینوں نے بیک زبان کہا۔''ماتا جی! وہ بارہ مولہ پہنچ چکے ہیں۔ لوگ آگے سے مزاحمت کررہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک یا دو دنوں میں سری نگر پہنچ چکے ہوں۔'' میں اس خبر پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی تصدیق اس طرح کی کہ عین ممکن ہے یہ افواہ ہو۔ اُن میں سے ایک میری بات پر ہنسا اور کہا۔''آپ کو اس قدر یقین کیوں ہے؟ آپ ایک دو دنوں میں خود دیکھ لیں گی کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔''

اگلی مرتبہ دونوں قبائلی سردار دوبارہ مجھے ملنے آئے اُن کے ساتھ دو اور آفیسر بھی تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کا کیپٹن (ASP) تھا جو میرے آبائی ضلع سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا رحم داد خان تھا جو ہزارہ ڈسٹرکٹ کے ایکسٹرا کمشنر کے طور پر معروف تھا۔ اُن دونوں نے مجھے سلام کیا اور رحم داد خان نے کہا۔''مجھے وزیر صاحب کے قتل کی خبر سُن کر بہت دُکھ ہوا ہے۔''

میرے پاس وہی جواب تھا جو میں پہلے بھی دے چکی تھی کہ''ایک ہیرو (Hero) کی موت پر ماتم نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے ہمدردی کی اتنی ضرورت نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گی کہ آپ ہمارے مردوں اور عورتوں کو اذیّت کیوں دیتے ہیں؟'' میں نے اپنی گفتگو میں کیپٹن کو مخاطب کیا تھا جس نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔''اب جہازوں اور توپوں کے ساتھ مکمل جنگ ہوگی۔ ہم دنیا کو بتا دیں گے کہ بہادر کیسے لڑتے ہیں۔''

رحم داد خان کا روّیہ نہایت دوستانہ تھا۔''میں نے آپ کے نڈر اور بے خوف بچوں کے بارے سُنا ہے۔'' اُس نے کہا۔''خُدا انہیں برکت دے۔ آپ نے بہت ہی جرأت اور صبر کا ثبوت دیا ہے۔ ہم آپ کو یہاں خوش رکھنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یہاں کا نیا وزیر آپ کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔''

اُس کے دوستانہ روّیہ سے شہ پا کر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ شہر کے حالات کو کنٹرول کریں اور اُن مشکلات اور مصائب کا ازالہ کریں جو حملہ آور لوگوں پر ڈھا رہے تھے۔ اُس نے تمام معاملات کو درست کر لینے کا وعدہ کیا۔

جب وہ جانے لگے تو پولیس کے کیپٹن نے پوچھا''اس جگہ کے کیپٹن (ASP) کے ساتھ کیا ہوا؟'' وہ مظفر آباد کے پولیس آفیسر کے بارے پوچھ رہا تھا۔''اُس کی فیملی یہاں نہیں تھی۔'' میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''ہاں، میں حملے سے تین دن پہلے یہاں آیا تھا اور جو یہاں تھا اُن سب سے ملا تھا۔'' یہ کہتے

ہوئے وہ مسکرایا اور بدنیت نگاہوں کے ساتھ ''کامیابی'' کا تاثر دیا۔ یہ شخص جاسوس کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ جس پولیس کیپٹن کا یہ ذکر کر رہا تھا وہ اُس وقت جب مہتاجی بنگلے سے نکلے تو اُن کے ساتھ تھا۔ لیکن بعد میں اُس نے ایک قریبی گھر میں پناہ لے لی تھی۔ پاکستانی اُسے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے اُسے دو میل سے اُس وقت پکڑ لیا تھا جب وہ پینے کا پانی لینے کے لیے باہر آیا۔ اِس کے بعد اُسے گولی ماردی گئی تھی۔ سابقہ انتظامیہ کے بے شمار آفیسر قتل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن حملہ آوروں کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ کشمیری پنڈتوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔

دن گزرتے رہے اور ہم اب تک اُسی بنگلے میں تھے۔ ماحول تجسّس اور شکوک وشبہات کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں مسلسل اپنے شوہر کے بارے سوچتی رہی اور بچوں کو بتاتی رہی۔ ''کتنی اچھی بات ہوتی کہ ہمارے پاس تمہارے باپ کی کوئی تصویر ہوتی۔'' ایک گھنٹہ بعد سُریش دوڑتا ہوا آیا اور اُس کے ہاتھ میں باپ کی ایک تصویر اور اُس کا نیگٹیو بھی تھا۔

''یہ تمہیں کہاں سے مل گئی؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

''ماں! میں ایک جگہ گھوم رہا تھا جب جھاڑیوں میں کوئی چیز نظر آئی جس نے میری نگاہوں کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ میں متجسّس ہو گیا اِسے اُٹھایا اور دیکھا کہ یہ پاپا کی تصویر تھی۔'' یہ انتہائی حیران کن بات تھی۔

قبائلی رحم داد خان کی وجہ سے ہمارے ساتھ مسلسل احترام کا برتاؤ کرتے رہے کیونکہ وہ خود بھی ہم پر کافی مہربان تھا۔ ہمارے راشن کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے ہمارے لیے کچھ آٹا، گھی، دال اور چائے بھیجی۔ دوسرے آفیسر بھی ہمیں ملنے کے لیے آئے۔ اُن میں سے ایک نیا وزیر بھی تھا جو محکمہ مال کا سابق تحصیل دار تھا۔ محکمہ مال کا آفیسر اور تحصیلدار دونوں کشمیری مسلمان تھے۔ قبل اِس کے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہم نے چند تکلّفات کا تبادلہ کیا کیونکہ انہوں نے یہ فیصلہ اچانک کیا تھا۔ ''آپ جانتی ہیں کہ ہم جہنم میں رہ رہے ہیں؟ ہم اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔''

نئے بندوبست میں آفیسر ہونا کوئی مذاق نہیں تھا۔ میں نے اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ ''اب آپ کو اس قدر مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور اُسے ادا کریں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ یہاں میں اپنی بیٹیوں کے ہمراہ اِن لوگوں میں رہ رہی ہوں اور اِن کے رحم وکرم پر ہوں۔ حالات کو اپنا راستہ خود بنانے دیں؟''

''لیکن وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں اور رحم داد خان یہ بات یقینی بنانا چاہتا ہے کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔''

رحم داد خان فی الواقع بہت مہربان تھا۔ اُس نے فوری طور پر مسز مودی کا طبی معائنہ کرنے اور اُس کے زخموں پر مرہم پٹی کرنے کے لیے ایک ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر بھیج دیا۔

حالات کے پیشِ نظر میرے بچے بھی ٹھیک ہی جا رہے تھے۔ صرف میرا چھوٹا بچہ صبح سویرے اُٹھنے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے پر اصرار کرتا تھا۔ میں اُسے شام کے کھانے سے بچ جانے والی روٹی دے دیا کرتی تھی۔ ایک دن اس معاملے میں معمول سے زیادہ شدت پیدا ہوگئی، جب اُس کی آنکھوں سے آنسوں چھلک پڑے اور اُس کے گالوں سے نیچے بہنے لگے تو اُس نے کہا۔ ''ماں! میں یہ روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ میرے گلے میں چپک کر اٹک جاتی ہے۔ میں اِسے نگل نہیں سکتا۔''

''میں جانتی ہوں، میرے بیٹے! لیکن کیا تم بہادر نہیں بنو گے، اگر تم یہ روٹی نہیں کھا سکتے تو تم اپنے ملک کے لیے کیسے لڑو گے؟ تم جانتے ہو کہ آج ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ایسے بھی ہیں جنہیں یہ روٹی بھی میسّر نہیں۔''

اُس نے اپنے آنسو صاف کیے اور جلدی سے روٹی کا وہ ٹکڑا جو اُس کے ہاتھ میں تھا، نگل لیا۔ چار روز کے بعد وہ میرے پاس آیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماں! تمہیں پتا ہے کہ اِس روٹی کا ذائقہ بسکٹ کی طرح ہے۔''

چند روز کے بعد ویمل بیمار پڑ گیا اور میرے پاس پیسے بالکل ہی نہیں تھے کہ میں اُس کے لیے دوا یا دودھ خرید سکتی۔ میں رحم داد خان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی جو اتفاق سے ہمارے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر مجھے دس روپے پیش کیے کہ میں انہیں ویمل کی بیماری پر خرچ کروں۔ لیکن مجھے دوسروں سے اُس طرح روپے مانگتے ہوئے اور لیتے ہوئے سبکی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ میرے دل میں کیا ہے۔ اس لیے اُس نے کہا۔ ''بہن جی! یہ روپے قبول کرنے میں آپ کو جو مشکل درپیش ہے، میں سمجھتا ہوں لیکن کیا ہمیں اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ڈھالنا نہیں چاہیے؟ کیا آپ اپنے لوگوں کی مدد بھی قبول نہیں کریں گی؟ کیا آپ مجھے اپنوں میں شمار نہیں کرتیں؟''

اُس نے پیسے ویمل کے حوالے کیے اور کہا کہ وہ بارہ مولہ کی طرف جا رہا ہے اور وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر ہمارے لیے بہتر انتظامات کرے گا۔

اُس وقت بارہ مولہ میں شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ قبائلیوں نے ہمارے گھر کا باورچی خانہ بند کر دیا تھا اور اُن کے دونوں سردار بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ قبائلی خود بھی کئی روز سے ادھر نہیں آ رہے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ دوسرے سپاہیوں نے جنہیں پیچھے چھوڑا گیا تھا، اُن ہندوؤں کے گھروں کو

جنہیں جیل سے رہا ہونے کے بعد دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی، لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت تک مقامی مسلمانوں کو بھی شاید پاکستان کی چال سمجھ میں آگئی تھی اور وہ خوفزدہ ہونا شروع ہو گئے تھے اور عجیب بات تو یہ تھی کہ اب وہ ہندوؤں سے مدد حاصل کرنے کی توقع کرنے لگے تھے اور اگر ہندو کسی مشکل میں ہوں تو اُن کی مدد کرنے کے لیے بھی آمادہ تھے۔

تاہم اس جذبے کے پیچھے وہ تازہ دم ناخوش گوار اطلاعات تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی فوج قریب پہنچ چکی ہے۔

ایک دن چمن لال مجھے ملنے کے لیے آیا اور مشورہ دیا کہ میں اُس کے گھر منتقل ہو جاؤں۔ ''آپ سب کا اکیلے اس گھر میں رہنا کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''میں نے سُنا ہے کہ حملہ آور پسپا ہو رہے ہیں اور یقینی بات ہے کہ پسپا ہوتے ہوئے وہ مزید لوٹ مار کریں گے۔'' میں اس لحاظ سے خوش نصیب واقع ہوئی تھی کہ کئی دوست ہمیشہ میری مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں یقیناً اس مشورے پر غور و خوض کروں گی اور دو یا تین دنوں تک اُسے مطلع کر دوں گی۔

ایک اور شریف النفس

ہمیں اپنے بنگلے میں واپس آئے کوئی دو ہفتے ہو چکے تھے۔ ہر طرف بے حس و حرکت سی خاموشی تھی جیسے وقت کی باگیں رُک گئی ہوں۔ آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں مسلسل گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی بصیرت ناقابلِ تلافی حد تک مستقبل سے ہٹ کر حال پر مرکوز ہو گئی تھی کیونکہ ماضی کے دامن میں اُن کے لیے کسی قسم کی کوئی تشفی نہیں رہ گئی تھی۔

بالآخر ہندوستان کے لڑاکا جیٹ طیارے افق پر نمودار ہونے لگے۔ تانبے کی مانند نیلے آسمان کے پسِ منظر میں وہ یوں نظر آتے تھے جیسے سیاہ رنگ کے کئی مریضانہ زرد دھبوں والے پرندے ایک ساتھ اُڑ رہے ہوں۔ اب یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی کہ ہندوستان کی فوج منظر پر متحرک ہو چکی ہے۔ ہم دو میل میں بم پھٹنے کی آوازیں سُننے لگے تھے۔ کبھی کبھی روشنی کی سُرخ اور نیلی چمک کے بعد ایسی گرج دار آواز سنائی دیتی جیسے زوردار کھانسی۔ پھر کالے بادلوں کا دھواں آسمان کی طرف بلند ہو جاتا۔ جس سے ہمیں یقین ہونے لگتا کہ اس شور سے ہماری چھت زمین بوس ہو جائے گی۔ قبائلیوں پر ایسا خوف طاری تھا جس میں یک گونہ تقدّس کی آمیزش بھی معلوم ہوتی تھی اور وہ اِن جہازوں کو ''خدا کا بیٹا'' کہتے تھے اور اُن سے بہت خوفزدہ تھے۔ اب مقامی مسلمان بھی کھلم کھلا ان ہندوؤں کا ساتھ دینے لگے جن کے گھروں میں قبائلی عورتوں کو اغواء کرنے کی غرض سے داخل ہوتے تھے۔ کئی مسلمانوں نے علی الاعلان شہر میں قتلِ عام کی مذّمت کی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلامی عقیدے کو خطرے کے حوالے سے لوگ دودلی کا شکار تھے۔ غلط اور صحیح کے بارے مقامی تصوّرات ٹھوس عملیّت میں ڈھلنا شروع ہو گئے اور مقامی مسلمانوں کے روّیے راستی کی طرف گامزن ہونے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کا اور ہندوؤں کا مقدّر ایک ہے۔

مسز مودی بہت فکر مند تھی اور بیٹیوں کے ساتھ بنگلے میں رہنے کی وجہ سے مجھے حد درجہ بے وقوف سمجھتی

تھی۔ مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ میں ایک خطرہ مول لے رہی ہوں اس لیے میں نے چمن لال کے گھر میں منتقل ہونے کی تجویز سے اتفاق کرلیا۔ ابھی جب ہم دوسرے گھر میں منتقل ہونے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھے تو اُوم اور شیوادیال سامان لے کر آگے چلے گئے۔ پولیس کانسٹیبل نے انہیں راستے میں روک کر پوچھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔

''ماتاجی نے ایک دوسرے گھر میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ بنگلے میں زیادہ دیر رہائش رکھنا غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔''

''نہیں، واپس جاؤ اور جا کر ماتاجی سے کہو کہ ہم انہیں کسی دوسرے گھر میں منتقل نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اُن کی حفاظت کے خود ذمہ دار ہیں۔ میں رات کو گھر کی نگرانی کے لیے مزید پولیس بھیج دوں گا۔''

ملازم واپس آگئے لیکن اُس رات پولیس نہیں آئی۔ دوسری صبح ہم نے سُنا کہ چمن لال کا گھر لوٹ لیا گیا ہے اور کئی خواتین کو اغواء کرلیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اڑوس پڑوس کے گھر بھی تباہ و برباد کردیئے گئے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میرا گھر اُن میں شامل نہیں تھا۔ میں اس سارے عرصے میں غیر معمولی طور پر خوش نصیب رہی ہوں اور عین وقت پر مصیبت سے بچ جاتی رہی ہوں۔

تقریباً چار روز کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوج نے بارہ مولہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ قبائلیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ پسپا ہو رہے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق پاکستانی فوج کے آفیسر قبائلیوں کو مار مار کر لڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود لڑائی کے میدان سے بھاگ رہے تھے اور راستے میں مختلف دیہاتوں سے گزرتے ہوئے ہر طرح کی لُوٹ مار میں مصروف تھے۔ پسپا ہوتے ہوئے مارے جانے والے کچھ حملہ آوروں کے سامان سے کٹے ہوئے انسانی اعضاء برآمد ہوئے جن کے ساتھ انگوٹھیاں اور کنگن وغیرہ تھے اور جنہیں جلدی کی وجہ سے وہ اُتارنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اس لیے انہوں نے عورتوں کے بازؤں اور ٹخنوں سمیت پاؤں کاٹ کر تھیلوں میں ٹھونس لیے تھے۔ ان واقعات نے مظفرآباد کے لوگوں کو رنج و غم کے علاوہ اذیّت اور درد کے احساسات میں ڈبو رکھا تھا کیوں کہ انہوں نے زندگی میں اس طرح کے واقعات نہ دیکھے تھے نہ سُنے تھے۔

ایک روز صبح سویرے چار بجے کے قریب ہمیں دل دوز چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ کسی کو انتہائی مشکل صورتِ حال کا سامنا تھا۔ عین اُسی وقت میں نے گھر کے باہر کسی کی آواز سُنی، جو مجھے باہر بلا رہا تھا۔ میں نے باہر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ ایک مولوی تھا جو ہمارے گھر کے قریب ہی ایک مسجد میں رہتا تھا۔ میں

اُس کو اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ مسز مودی کا خیال تھا کہ یہ کوئی دھوکہ ہو سکتا ہے لیکن میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں باہر گئی تا کہ مولوی کی بات سُن سکوں۔ اُس نے سوچا تھا کہ شاید ہمارے گھر سے کسی نے اُسے مدد کے لیے پکارا ہے۔ اس لیے وہ اِدھر آ نکلا کہ شاید وہ کوئی مدد کر سکے۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے لیے اِس بنگلے میں رہنا محفوظ نہیں ہے، اُس کا خیال تھا کہ عین ممکن ہے، بلکہ اغلب ہے کہ حملہ آور اِس گھر کی طرف آئیں گے اِس لیے ہم سب یہاں کی بجائے اُس کے گھر میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اِس تجویز سے اتفاق کر لیا کہ ہم اُس کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن مسز مودی اب بھی اُس کی نیّت پر شک وشبہ کا اظہار کر رہی تھی۔ چونکہ وہ مولوی تھا اِس لیے اس بات کا امکان موجود تھا کہ حملہ آور اُس کے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے اور ہوا بھی یہی، جیسا کہ ہم نے سُنا کہ اُس کے دوسرے روز حملہ آور ہمارے بنگلے میں داخل ہو گئے۔

بچوں نے مولوی کے گھر کو اچھی طرح چھان مارا۔ ایک کمرے میں انہیں کچھ فرنیچر ایسا ملا جو دراصل ہمارے گھر سے لایا گیا تھا۔ وہ یہ اطلاع دینے کے لیے دوڑ کر میرے پاس آئے۔ ''ماں! دیکھیں یہ سب ہماری چیزیں ہیں۔''

میں نے انہیں خاموش کیا اور کہا ''ارے! یہ کوئی بات نہیں۔ اگر یہ یہاں نہ لائی گئی ہوتیں تو یہ گھر کے ساتھ ہی جل چکی ہوتیں۔ یہ زیادہ اچھا ہے کہ کوئی انہیں استعمال کر رہا ہے۔'' ویسے بھی یہ وقت کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا کہ اس بارے مولوی کے ساتھ بات کی جاتی۔

مسلمانوں میں بھی حواس باختگی کا عالم تھا۔ انہیں اطلاع ملی کہ ہندوستانی فوج کی ایک سکھ رجمنٹ آگے بڑھ رہی ہے اور یہ بھی کہ جن مقامی مسلمانوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا ہے انہیں بھاری سزائیں مل رہی ہیں۔ ایک رات کو تمام مقامی مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر چھوڑ دیں گے۔ مولوی خود بھی بے آرامی کا شکار تھا اور اُس کی بیوی اپنی بیٹیوں کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ ایک لمبے عرصے سے اسی جگہ رہ رہی تھی اور اب اس زمین میں جڑیں پکڑ چکی تھی۔ اس کے لیے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ وہ زندگی بھر کی یادوں اور روایات کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے۔

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مجمع گھر کے باہر موجود تھا۔ عورتیں بین کر کر کے رو رہی تھیں۔ اور مرد مستقبل کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جلدی جلدی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں اعتماد اور یقین کے ساتھ محسوس کر رہی تھی کہ ہندوستانی فوج کے خوف سے انہیں شہر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اُن میں سے چند ایک کو میں نے سوچنے اور

غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ ''مہربانی کر کے میری بات سُنیں۔'' میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ کو اتنی آسانی سے پاکستان کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ آپ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

اُن میں سے ایک آدمی نے میری باتوں پر احتجاج کیا۔ اُس نے کہا۔ ''آپ نہیں جانتیں کہ جموں میں کیا ہوا ہے؟ ہندوستانی فوج کے سپاہی یہاں شہر میں جا بجا ہندوؤں کی بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے اور نہ ہی لٹے پٹے کھلے ہوئے دروازوں والے خالی گھروں کو دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ بالآخر ہمیں ہی اِن سارے واقعات کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

''میں جموں میں ہونے والے واقعات کے بارے کہانی کے ایک لفظ کو بھی درست نہیں سمجھتی۔ جو بھی ہو آپ کو یہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اور میں آپ کے ساتھ یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کسی ایک نے بھی مرنا ہے تو سب سے پہلے میں مروں گی۔ میں آپ سب کو لے کر دو میل جاؤں گی اور آپ سے آگے آگے مارچ کروں گی اور سب سے پہلی گولی کا نشانہ بنوں گی۔ ویسے بھی ہندوستانی فوج کے آفیسروں سے ڈائیلاگ کرنا اِن حملہ آوروں کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہوگا۔

اس سے اُن میں قدرے حوصلہ پیدا ہوا اور اب میرے لیے اُنہیں قائل کرنا آسان ہو رہا تھا کیوں کہ وہ بھی تو فوری طور پر اپنا گھر بار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ سب میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور اُن میں سے ایک نے کہا۔ ''آپ اُن لوگوں کو جانتی ہیں جو حملہ آوروں کے پاس چلے گئے تھے۔ اس لیے آپ کو ہماری بے گناہی ثابت کرنا ہوگی۔ ہم تو حملہ آوروں کو یہاں نہیں لانا چاہتے تھے اور نہ ہی اُنہیں یہاں دیکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ہندو اور مسلمان تو اِس شہر میں اچھی طرح زندگی گزار رہے تھے۔''

اُن میں سے کچھ ایسے تھے جو شہر میں ٹھہر جانے کو عقل مندی کے خلاف سمجھتے تھے لیکن کچھ دوسرے اس کے برعکس سوچتے تھے اور اِس بارے دو آراء موجود تھیں۔ اُن سب نے فیصلہ کیا کہ وہ عبدالعزیز کے گھر جا کر اُس سے مشورہ کریں گے۔

عزیز ایک درزی تھا اور شروع دن سے کشمیر نیشنل کانفرنس کا ممبر تھا۔ وہ ہر مقامی تحریک میں اگلی صفوں میں ہوتا تھا، جو سیاسی حقوق اور بہتر معیارِ زندگی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ اُس نے ہر سادہ دل انسان کے دل میں جگہ بنا رکھی تھی۔ حملہ آوروں کے آنے سے کچھ ہی روز پہلے وہ جیل سے رہا ہوا تھا۔ اُس نے اتنی زیادہ مجبور و محتاج ہندو خواتین کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی جتنی کہ اُس کے لیے ممکن تھا۔ محتاط اندازے کے مطابق

اس کے گھر میں چار سو سے زیادہ خواتین نے پناہ لے رکھی تھی کیونکہ اُس نے اپنے گھر کا سارا سامان باہر نکال لیا تھا۔

عزیز کا بھی یہی خیال تھا کہ مسلمانوں کو شہر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اُس نے انہیں نصیحت کی کہ وہ متحد ہو کر مضبوطی سیکھڑے رہیں اور ہندوؤں کی مدد کریں۔ اُس نے اعلان بھی کر دیا کہ اُسے مجھ پر پوڑا بھروسہ ہے کہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ اُس نے مجھے پیغام بھی بھیجا کہ وہ مجھے خوشی سے اپنے گھر میں پناہ دے دے گا۔

حملہ آور عزیز سے خوش نہیں تھے اور اُنہوں نے اُسے بے شمار دھمکیاں دے رکھی تھیں، بلکہ اُس کا گھر بھی لُوٹ لیا تھا۔ اس کے باوجود اُس نے اپنی قابل قدر سرگرمیاں جاری رکھیں اور گرفتار ہو گیا۔ بعد میں ہمیں اطلاع ملی کہ اُسے گولی ماردی گئی تھی۔

12

ایک اور وزیر کی زوال پذیری

ابھی تک مولوی اپنی مذہبی حیثیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مذہب کے جھنڈے تلے محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کرلیا تھا کہ اگرچہ حملہ آور نہ تو عورت کا احترام کرتے ہیں اور نہ ہی مال ومنال کا، لیکن وہ ہیں تو اُسی مذہب کے پیرو جس کا وہ ترجمان تھا اس لیے وہ یقینی طور پر اُسے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن اب اُسے کسی طرح یہ یقین ہونے لگا کہ وہ اُسے زیادہ دیر تکمنفر دنہیں رہنے دیں گے۔ انجانا سا خوف اُس کے روایتی توازن کو درہم برہم کرنے لگا اور اُسے معمول کی سنجیدگی اور مربّیانہ گفتگو سے محروم کرنے لگا۔ اُس نے اپنے لکڑی کے دروازے کے تختوں میں کیلیں گاڑھ دیں اور رائفل لوڈ کر کے قریب رکھ لی۔

دوسرے مسلمان بھی خوف زدہ تھے اور اس جذبے سے قرآن کی تلاوت کرتے تھے جو فطری بھی تھا اور خوف کی پیداوار بھی۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ''حملہ آور بہر حال مسلمان تھے اور یقیناً قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے لوگوں کو تکلیف نہیں دیں گے۔'' ان کا خیال تھا۔ لیکن یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ کیوں کہ ایک مرتبہ وہ ایک کشمیری کے گھر میں داخل ہوئے جو بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

''ہم سب مسلمان ہیں۔'' اُس نے حملہ آوروں سے مکالمہ کرنے کی کوشش کی اور کانپنے لگا۔ ''کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میں قرآن مجید پڑھ رہا ہوں؟ بھائیو! آپ کو چاہیے کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیں؟''

حملہ آوروں نے اپنے عزائم کے بارے اُسے کسی شک وشبہ میں نہیں رہنے دیا اور جواب دیا۔ ''ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ ہم تو جس خدا کی عزت واحترام کرتے ہیں اُس کا نام پیسہ ہے۔''

انہوں نے اُس کے گھر کی ہر چیز لوٹ لی۔ حتیٰ کہ قرآن کو بھی پھاڑ دیا اور اُس کے اوراق کو فرش پر بکھیر دیا۔ اس حادثہ کی خبریں اردگرد پھیل گئیں۔ پاکستانی یہ افسانہ برقرار رکھنے کے لیے کہ حملہ آور کافروں کے خلاف محض جہاد کی غرض سے آئے ہیں۔ وہ روزانہ مسجدوں میں قرآن خوانی کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

نیا وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) پنڈت تارا چند اکثر ہمیں ملنے آیا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی اپنے

مصائب کا ذکر ہم سے نہیں کیا۔ میں البتہ اُس کی تھکی ہوئی آنکھوں اور منتشر چہرے سے اندازہ کرسکتی تھی کہ اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ حملہ آوروں کے ساتھ ٹھیک طرح سے نہیں چل رہا۔ چند روز کے بعد ہم نے سُنا کہ وہ اعتماد کھو چکا ہے اور اپنا عہدہ بھی۔ اُس کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اُس نے ایک مسلمان درزی کے گھر میں پناہ لی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اُس میں زندہ رہنے کے لیے مطلوبہ قوتِ ارادی ختم ہو چکی ہے اور جلد ہی اُسی گھر میں انتقال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اُسے دفن کر دیا۔ اُس کے بچے، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بعد میں ہلال احمر (ریڈ کراس) کے ذریعے دوسرے مہاجرین کے ساتھ مہاجر کیمپوں میں پہنچا دیے گئے۔

ہمیں مولوی کے گھر میں دس روز ہو چکے تھے اور ہمارا راشن بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مولوی چونکہ یہ راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ہم اُس کے گھر میں رہ رہے ہیں، اس لیے ہمارے لیے راشن کا انتظام کرنے کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

بچوں کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا اس لیے وہ سردی سے کانپتے تھے۔ اُن کے پھٹے پرانے کپڑے انہیں گرم رکھنے کے لیے کافی نہیں تھے۔ ایسا ہوا کہ ایک روز انہوں نے کچھ لڑکوں اور لڑکیوں کو باہر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ شیلا نے فوراً دیکھ لیا کہ اُن میں سے کچھ وہ کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کبھی ہمارے ہوا کرتے تھے۔ میرے بچے دوڑ کر اندر آئے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ سب یک دم بول پڑے۔

"ماں! وہ میرا فراک پہنے ہوئے ہے۔"

"اس نے میرا کوٹ پہن رکھا ہے۔"

"ماں! جا کر ہمارے کپڑے واپس لا دیں۔ ہم یہاں سردی سے کانپ رہے ہیں اور اُن لوگوں نے ہمارے کپڑوں کی نمائش لگا رکھی ہے۔"

میں نے انہیں پُرامن رکھنے کی کوشش کی اور وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ میرے لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں خود جا کر اِن بچوں سے جھگڑا کروں۔ میں نے اُنہیں بتایا۔ "اُن کے لیے بھی یہ اچھا نہیں ہوگا کہ اُنہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُنہوں نے آپ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ جاؤ اور جا کر اُن کے ساتھ اُسی طرح کھیلو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو اچھی زندگی گزارنے کا موقعہ ملا تھا اور وہ دوسروں کو بھی اچھے لباس میں دیکھنے کے عادی تھے اور جو کپڑے کبھی اُن کے پاس ہوا کرتے تھے اب وہ اِن دوسرے بچوں کے لیے کسی قیمتی

تحفے سے کم نہیں تھے۔ عام حالات میں جنہیں قبول کرنا بھی اُن کے لیے مشکل تھا۔

اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور ہم حسبِ معمول دروازہ بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی مسجد گیا ہوا تھا۔ کوئی آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور ہم نے دروازہ کھولنے سے قبل قدرے جھجک کا مظاہرہ کیا۔ ایک پاکستانی آفیسر تھا اور اُس کے ساتھ تین سپاہی۔ آفیسر نے پوچھا۔ ''کیا وزیری صاحبہ یہاں ہیں؟'' میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں مجھے ملنے آیا تھا اور میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہی تھی کہ میں اُسے کیا بتاؤں۔ آخر میں مجھے یہی سوجھی کہ اُس سے ملنا میرے لیے محفوظ ہوگا لہذا میں آگے بڑھی۔

''میرے شوہر وزیر (ڈپٹی کمشنر) تھے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

آفیسر نے مجھے مؤدبانہ ''سلیوٹ'' کیا اور کہا۔ ''بہن جی! میں صبح سے مختلف گھروں میں آپ کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ رحم داد خان نے یہ راشن آپ کے لیے بھیجا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ چند روز میں وہ خود بھی یہاں آجائے گا۔'' سپاہیوں نے کچھ آٹا، گڑ اور نمک ہمارے حوالے کیا اور چلے گئے۔

ظاہر ہے کہ مولوی نے بھی آرمی کے جوتوں کی دھک دھک، جو اُس کے گھر کی طرف آرہے تھے سُن لی ہوگی اس لیے وہ بھی مسجد سے بھاگ کر گھر آگیا۔ یہ قیاس کر کے کہ شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے پاکستانی یہاں آگئے ہیں، وہ بہت گھبرا گیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ اِن لوگوں کو رحم داد خان نے بھیجا تھا، اُس نے سُکھ کی سانس لی اور چیختے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تو یہ تھا کہ اِس گھر میں کوئی آپ کو نہیں جانتا۔''

اس وقت تک مولوی میرے ساتھ نہایت ہمدردانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے طویل مذہبی بحثوں میں مصروف رکھتا تھا اور میں صبر و تحمل سے اُس کی بات سنتی رہتی تھی۔ لیکن اس کی بیوی شاید اس وجہ سے ہم سے جلتی تھی کہ پاکستانی ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اُسے راشن میں سے حصہ دے کر ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس نے پھر بھی دشمنی کا روّیہ جاری رکھا۔

مولوی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ ایک دفعہ میں نے اُسے اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے سُنا۔ ''مہربانی سے اِن لوگوں کے ساتھ نرم روّیہ اختیار کریں۔ وہ ہمارے مہمان ہیں اور اس کے علاوہ تمام آفیسرز سے اِن کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اگر اُنہیں پتہ چل گیا کہ ہم انہیں تنگ کرتے ہیں تو ہمیں کسی مصیبت کا سامنا ہو سکتا ہے۔''

ایک شام کو مجھے خبر موصول ہوئی کہ رحم داد خان آیا ہوا ہے۔ میں اُسے ملنے کے لیے فکر مند تھی لیکن ہمارے لیے گلیوں میں نکلنا اب بھی غیر محفوظ تھا۔ اس کے باوجود میں وزیر کے گھر گئی، جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ رحم داد خان مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور کہا۔ ''آپ نے یہ سب تکلیف کیوں کی ہے۔ میں نے بہر حال صبح سویرے

آپ سے ملنے کے لیے آنا ہی تھا۔'' اُس نے اگلی صبح میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تا کہ مختلف معاملات پر بات کی جا سکے۔ سو میں نے راشن کے لیے جو اُس نے بھیجا تھا، اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چلی آئی۔

دوسری صبح رحم داد خان کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مظفر آباد سے کہیں اور جانا پسند کروں گی۔ میں نے یہ جگہ نہ چھوڑنے کے سلسلہ میں اپنی منشاء کو نہیں چھپایا اور اُس نے بھی کہیں اور جانے پر اصرار نہ کیا۔ میں نے اُسے اُن واقعات کی ساری رُوداد بیان کی جو اُس کی غیر حاضری میں واقع ہوئے تھے کہ کس طرح خواتین کے ساتھ اب بھی بدسلوکی ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ کی قیدی ہوں اور مجھے کچھ بھی کہنے کا حق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں میں آپ کو یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہتی کہ میں آپ کو اخلاقیات کا درس دے رہی ہوں، کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو آپ پہلے سے نہیں جانتے۔ انسانی مرضی اور رضا کسی قسم کے اخلاقی بندھن سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتی، جن پر ہم سب ایمان رکھتے ہیں۔ آپ کے لوگوں نے اپنے دین کے نام پر اُن تمام مسلّمہ انسانی اقدار کو پامال کیا ہے جو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ بالآخر اُن کے یہ حربے اُن کے اپنے حق میں بھی ناکام ہو جائیں گے۔ اُن کے اِن اعمال کے ٹھوس نتائج بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اِس راہ پر چلتے ہوئے وہ خود بھی تحلیل ہو سکتے ہیں۔'' اُس نے مجھے تفصیلی جواب تو نہ دیا لیکن مجھے مطلع ضرور کیا کہ اُس نے خواتین کی حفاظت کا اہتمام کر لیا ہے۔ تاہم، جب میں نے اُس سے یہ اجازت لینے کی کوشش کی کہ مجھے اُن کی نگرانی کا کام تفویض کیا جائے تو اُس نے کہا۔'' آپ یہ کام نہیں کر سکیں گی۔''

ایک ڈاکٹر کے علاوہ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو اُس روز گفتگو میں شریک نہیں ہوا۔ یہ آدمی کچھ دن بعد مجھے ملنے کے لیے آیا اور اپنے آپ کو خان کے نام سے متعارف کروایا اور کہا۔'' میں ڈاکٹر کا دوست ہوں اور ہم سب آپ کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ مجھے ایک کمرے سے تختے کے نیچے کچلی ہوئی چند ہڈیاں ملی ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے شوہر کی لاش اس کمرے میں جلی ہے۔ کیا آپ انہیں دریا میں بہانا پسند کریں گی؟'' میں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا اور کہا۔'' ہاں میں ایسا کرنا بالکل پسند کروں گی لیکن دریا پر کون جائے گا؟''

اُس نے پیش کش کی'' میں آپ کے ملازموں کے ساتھ کشن گنگا تک چلا جاؤں گا۔''

اسی اثنا میں مولوی کو معلوم ہو گیا کہ یہ اجنبی کون ہے۔ خان نے مولوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔'' مولوی صاحب! کیا آپ اس خاتون کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے، جسے میں اپنی بہن سمجھتا ہوں؟ یاد رکھیے کہ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو آپ کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔'' پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے

مسز مودی اب پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن اُس کا زخم ابھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوا تھا۔ سابقہ ڈاکٹر اب نہیں آتا تھا اور نیا بھی ایک ہی مرتبہ رحم داد خان کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ریاست کی فوج میں ڈاکٹر تھا اور اسلام قبول کرنے سے پہلے کشمیری پنڈت کہلاتا تھا۔ کچھ دن تک وہ روزانہ مسز مودی کے زخم کی ڈریسنگ کے لیے آتا رہا تھا۔ وہ مسکراتا نہیں تھا، لیکن اکثر آہ بھرتا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ایسی گفتگو شروع ہو جائے جس کے دوران وہ کچھ وضاحت اور اپنے کیے کا جواز پیش کر سکے۔ یا شاید باہر کی دُنیا سے وہ بالکل لاعلم ہو چکا تھا جسے نہ تو ماضی کی یاد کو قبول کرنے کا حوصلہ تھا اور نہ ہی اسے اپنے شعور کا حصہ بنانے کا۔ اسی لیے وہ اس ساری حقیقت کو آہوں کے ذریعے خارج کر کے اطمینان حاصل کرتا تھا۔ مجھے کبھی اُس کے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے میں صحیح طور پر نہ سمجھ سکی کہ اُس کی پریشانی کا سبب کیا ہے۔

ڈاکٹر دس اور لوگوں کے ساتھ ہمارے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ سب مولوی کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے اور اکثر اُسے ملنے اس کے گھر آتے رہتے تھے۔ وہ سب اُسی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو پاکستانی اُس مسجد میں خطاب کرتے تھے جن میں ڈاکٹر اور اُس کے دوست بھی باقاعدگی سے آتے تھے۔ ڈاکٹر خان کے ساتھ اُوڑی محاذ پر بھی گیا۔ اُنھوں نے آرمڈ کور کی گاڑیوں میں سفر کیا جنہیں ممکنہ ہوائی حملے سے بچانے کے لیے مٹیالے، زیتونی اور سبز رنگ کا پینٹ کر کے سبز گھاس میں لپیٹا گیا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر اپنے پانچ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مولوی کے گھر آیا اور میرے ساتھ ملاقات کا عندیہ ظاہر کیا۔ اُن میں پروفیسر مقبول قریشی بھی تھا جو سری نگر سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ وہ میرے شوہر کا کلاس فیلو تھا اور اس سے قبل وہ کئی بار ہمیں ملنے کے لیے آ چکا تھا۔ میں ٹھیک نہیں تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اُنہیں اندر بُلا کر اُن سے ملاقات کروں۔ میں نے اُنہیں کہلا بھیجا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں اس لیے اُن سے نہیں مل سکوں گی۔ لیکن اُنھوں نے ملے بغیر جانے سے انکار کر دیا۔ میں قدرے ناراض ہوئی اور گھر سے باہر آ گئی۔

''آپ مجھے آرام کیوں نہیں کرنے دیتے؟'' میں نے چیخ کر کہا

''میں نے آپ کو بتایا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ بہر حال اب آپ بتائیں کہ آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

عام طور پر وہ مجھ سے میرے تجربات کے بارے جاننا چاہتے تھے لیکن اُس وقت میں اُن کے ساتھ کسی قسم کی تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اُن میں سے ایک نے سُریش کی طرف غور سے دیکھا اور مجھے ایک تجویز دی۔ ''مجھے بیچارے اِس لڑکے کا افسوس ہے جسے سکول بھی نہیں بھیجا جا سکتا۔ اگر آپ مجھے اجازت

دیں تو میں اِس کی تعلیم کا خیال رکھوں۔"

"بہت شکریہ! لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے بچوں پر رحم کھائیں۔" میں نے بہت تلخی اور اختصار سے کام لیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ اُس وقت آئیں گے جب میں قدرے بہتر ہو جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ عورتوں کی تلاش میں تھے، جنہیں وہ اپنے ساتھ لے جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ گھر گھر گھومتے رہتے ہیں۔

نجومی

ہم عملی طور پر صرف آٹے پر گزر بسر کر رہے تھے۔ میں دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتی تھی، پھر بھی مجھے پیچش (Dysentry) کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر کو بُلانے کے لیے شیوا دیال کو بھیجا اور وہ ایک ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آیا۔ یہ ڈاکٹر ایک جنوبی مسلمان تھا اور جب سے مظفر آباد میں آیا ہوا تھا اُس وقت سے مسلسل مقامی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی ناقابلِ یقین کہانیاں سُنا تا رہتا تھا۔ ایک روز جب میں صحن میں اُس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی، ہماری آوازیں قریب ہونے کی وجہ سے جہازوں کی گھن گرج میں ڈوب گئیں۔ میرے جملے کے اختتام کا انتظار کیے بغیر ہی ڈاکٹر نے بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لے لی۔ وہ وہاں پریشان اور اُداس کھڑا تھا کہ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''کیا آپ گھر کے اندر پناہ لینا مناسب نہیں سمجھتے تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو بھی جائے تو لوگ آپ کی دانش پر مبنی مشوروں کو یاد رکھ سکیں۔'' یوں لگا جیسے وہ میری طنز سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ بعد ازاں مسجد میں کسی ہفتہ وار میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''مسز مہتا اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اُس نے مجھے چھپ جانے کو کہا، جبکہ ہم قبائلی لوگ کسی قسم کے خوف سے واقف نہیں ہیں۔''

عاشق حسین اور میاں ناصر دونوں کشمیری مسلمان تھے جو حملوں کے دوران ریاست کشمیر کے دارلحکومت سے بھاگے ہوئے تھے۔ عاشق اب وزیر (ڈپٹی کمشنر) بن گیا تھا اور میاں ناصر پولیس سپرنٹینڈنٹ۔ وہ مجھے ملنے آئے اور پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ جب میرا راشن ختم ہو جائے گا تو میں اُنہیں مطلع کر دوں گی۔ رحم داد خان جو ہم پر بہت مہربان تھا تبدیل ہو چکا تھا، مولوی کو بھی انتظامیہ میں کوئی عہدہ مل گیا تھا۔

اس دوران جو لوگ مجھے ملنے آئے اُن میں ایک معزز ستّر سالہ پٹھان بھی تھا۔ وہ ایک نیک روح کا مالک نظر آتا تھا جو کئی سال تک الٰہ آباد میں رہ چکا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ قبائلیوں کا حملہ اسلام کے نام پر ایک

دھبہ تھا۔ وہ پرانی یادوں کو کریدنے پر مائل تھا اور ماضی کے اچھے دنوں کے بارے بتا رہا تھا جب وہ دیگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ آنند بھون (Anand Bhowaun) گیا جہاں اُن سب کو مٹھائی پیش کی گئی تھی۔ ''ہم سب اچھے دوست تھے۔ لیکن دیکھیں کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ انسان کے اندر کی ساری خباثت کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ غلیظ خواہشیں اور انتقام۔ یہ سب اِن کے کسی کام نہیں آئیگا۔'' اس کے بعد وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

سردار ابراہیم پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کے سربراہ تھے اور جب وہ مظفر آباد آئے تو لوگ اُن کا خطاب سننے کے لیے مسجد میں جمع ہو گئے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ میں ایک مولوی کے گھر میں ہوں تو وہ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ خان اور دُرّانی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ دُرّانی جموں میں پلیڈر (وکیل) رہ چکا تھا اور میں اُسے اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ اُس کی بہن میری دوست رہی تھی۔ جب میرے شوہر پونچھ میں گورنر کے عہدے پر تعینات ہوئے تھے تو سردار ابراہیم بھی وہاں وکالت کرتے تھے۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس سارے خون خرابے میں اُن کی بھی کوئی ذمہ داری ہو سکتی ہے۔ انہوں نے مہتا جی کے انتقال پر میرے ساتھ تعزیت کا اظہار کیا اور کہا کہ اُن تمام تکالیف کے لیے جن کا مجھے سامنا کرنا پڑا ہے، اُنہیں معاف کر دوں۔

میں جواب دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ ''سردار صاحب! آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ سماجی اخلاقیات کے علاوہ یہاں اور بھی کئی موضوعات اور معاملات قابلِ غور ہیں۔ آپ کے لوگوں نے قتل و غارت اور لُوٹ مار کی ہے ظلم و ستم اُن کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ جو اس قدر وسیع پیمانے پر زیادتیاں کرتے ہیں کہ بالآخر خود بھی نقصان اُٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اِس حد تک ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں کہ زندگی میں کبھی لاشعوری طور پر بھی ذہنی اذیّت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ سماجی لحاظ سے بھی یہ لوگ کسی پر امن سماج کے لیے یقینی طور پر بے معنی ہو جاتے ہیں۔ سردار صاحب! آپ اپنی تاریخ سے واقف ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے اسباق سے بھی واقف ہوں گے۔''

انہوں نے کہا۔ ''ہم لوگوں پر ظلم و ستم نہیں کرتے۔'' میں دوبارہ بولنے والی تھی جب خان نے مداخلت کر کے مجھے چُپ کرا دیا اور کہا۔ ''ہم کسی بھی طرح کشمیر نہیں چھوڑیں گے۔'' اس جملے پر اُس کے اور سردار ابراہیم کے درمیان بحث چھڑ گئی لیکن میں یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ کس بات کے حق میں اور کس کے خلاف دلائل دے رہے ہیں۔ جب اُن کی بحث ختم ہوئی۔ سردار صاحب نے کہا۔ ''میں اِن خواتین کو جلد از جلد ہندوستان بھیجنا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ جانا چاہیں۔''

''کیا آپ کو کوئی شک ہے کہ اِن کا انتخاب کیا ہوگا؟ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان سب کی درخواستیں ابھی آپ کو پیش کر سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، یہ اس طرح نہیں ہوگا۔ جب میں لاہور جاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں وہاں سے ریڈیو پر اس کا اعلان کر سکوں گا۔ اس کے بعد آپ سب کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔''

انہوں نے اس کے بعد مولوی سے کہا۔ ''آپ نے اِن خواتین اور بچوں کا خیال رکھ کر بہت اچھا کیا ہے۔'' انہوں نے مجھ سے پھر پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اِن کے بچوں کی طرف دیکھیں۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں جو انہیں گرم نہیں رکھ سکتے۔ آٹے کے علاوہ اِن کے پاس کھانے کو اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔'' سب معاملات ٹھیک کرنے کا وعدہ کر کے سردار صاحب رخصت ہو گئے۔

ٹھیک چار دن کے بعد سردار صاحب نے کپڑوں کے چار جوڑے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے پرانے کپڑے بھیجے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی کپڑے لانے والوں نے راستے میں کی ہے کہ اُنہوں نے نئے کپڑے خود رکھ کر اپنے دوستوں کے پرانے کپڑے ہمیں دیئے۔ اس کے علاوہ اِن کپڑوں کے ہمراہ کچھ صابن بھی تھا۔

ایک اور ملاقاتی ایک فارسٹ رینجر تھا جو میرے شوہر کو جانتا تھا۔ اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کشمیر چلی جاؤں۔ اُس نے بتایا۔ ''یہ آپ اور دیگر سب کے لیے جو جانا چاہتے ہیں بہت اچھا موقع ہے۔ دس لاریاں جو روالپنڈی سے ہمارے لیے غلہ لائی ہیں خالی واپس جا رہی ہیں۔ یہ آپ کو راولپنڈی تک لے جا سکتی ہیں اور وہاں سے آگے جموں جانا بہت آسان ہے۔

''میں آپ کی تجویز پر غور کروں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اس پر غور کریں اور مجھے ہسپتال میں مطلع کریں جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

ہم نے ایک مختصر سی میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ ہم اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ اچھا فیصلہ تھا کیونکہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ہم سب کو راستے میں قتل کر دینا چاہتا تھا۔

ہمیں مولوی کے گھر میں دو ماہ ہو چکے تھے۔ مولوی اور اُس کی بیوی دونوں ہی ہم سے تنگ آ چکے تھے لیکن اُنہیں خان اور دوسرے آفیسروں کا ڈر تھا جو انہیں کوئی سخت قدم اُٹھانے سے روک لیتا تھا۔ مولوی اپنی ناپسندیدگی کو، بالخصوص چمن لال کے بارے، ہرگز نہیں چھپاتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ''یہ آدمی بہت دھوکہ باز

ہے۔ کیونکہ وہ کانگریس کا ممبر ہے۔'' دراصل چمن لال ہی وہ آدمی تھا جو ہمیں ہندوستانی فوج کے بارے کچھ معلومات بہم پہنچا دیتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر کسی کو ساتھ لے آیا اور میرے ساتھ اُس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ۔'' یہ بمبئی کا جیولر ہے۔ یہ پنڈت نہرو کو بھی جانتا ہے اور آپ کی مدد کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

جیولر نے سریش کی طرف دیکھا اور کہا۔'' کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ میں غیر شادی شدہ ہوں اور اس کو اپنا بیٹا بنانا پسند کروں گا۔''

میں نے کہا۔'' میرے پاس اب صرف یہی بچے رہ گئے ہیں۔ میں اِن میں سے کسی سے بھی جدا نہیں ہونا چاہتی۔''

ڈاکٹر کو گفتگو کا یہ انداز پسند نہیں تھا اس لیے اُسے ملامت کرنے لگا۔ جیولر نے بات سمجھ لی اور موضوع کو بدل لیا۔ اُس نے میرا نام پوچھا اور کہا۔'' آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے مستقبل کے بارے پیشن گوئی کر سکتا ہوں۔''

''پیشن گوئی کرنے کے لیے آپ کے پاس ہے ہی کیا۔ مجھ پر سب کچھ پہلے ہی واضح ہے۔''

انتہائی پیغمبرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔'' یوں لگتا ہے آپ کے خوشی کے دن تو لدّ چکے ہیں لیکن خوش و خرم زندگی گزارنا اب بھی آپ کے اختیار میں ہے۔ ایک کمزوری آپ کے راستے میں حائل ہے۔ آپ کسی پر اعتماد نہیں کرتیں۔ اگر آپ کسی دوست کی بات سنیں تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ بصورت دیگر آپ بدحالی کا شکار ہو کر اندھی ہو جائیں گی۔''

میں نے اُس کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ میرے مستقبل کے بارے پیشن گوئی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہذا اُس نے پوچھا۔'' کیا میں تنہائی میں آپ کے ساتھ بات کر سکتا ہوں؟ میں آپ کو کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔'' میں اُسے صحن کے ایک کنارے پر لے گئی۔ اگرچہ مسز مودی اور دیگر نہیں چاہتے تھے کہ میں تنہائی میں اُس کے ساتھ بات کروں۔

''میری بہن کا ایک بیٹا ہندوستان میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ آئیں تاکہ اُسے آپ کے بدلے میں یہاں لا سکوں۔''

اس کے بعد اُس نے میرے سامنے چند اور نا قابلِ عمل تجاویز پیش کیں اور پھر بدتمیزی کرنے پر اُتر آیا۔ میں یہ سارا وقت اس خود ساختہ پیغمبر کو دیکھتی رہی تھی جس کی پیشن گوئی کا خلاصہ یہ تھا۔ وہ دوست تھا اور اگر

میں اس کے ساتھ ہندوستان جانے پر تیار نہیں ہوں گی تو مجھے بُرے دن دیکھنے پڑیں گے۔میں نے اُسے برملا ٹالنے کی کوشش کی۔''اپنا ایڈریس مجھے دے جائیں۔میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہندوستان پہنچ کر آپ کے بھانجے کو یہاں بھجوادوں گی۔''

اُس نے اصرار کیا۔''آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔میں آپ کو سیدھا پنڈت جی کے پاس لے چلوں گا۔''

''میں آخری بار آپ سے کہتی ہوں کہ میرا آپ کے ساتھ جانے کا قطعاً کوئی ارداہ نہیں۔جب میں ہندوستان گئی تو پنڈت جی سے خود مل لوں گی۔''میں نے حتمی طور پر اُسے بتادیا۔

تب اُس نے اپنا ایڈریس مجھے دیا اور کہا کہ اگر مجھے کوئی ضرورت پڑے تو اُسے خط لکھ دوں۔جیولر ذہنی توازن کھونا شروع ہو گیا تھا۔وہ اس وجہ سے ناراض تھا کہ اُس کے سارے منصوبے ناکام بنادیئے گئے اور میں اُس کی چال کو سمجھ گئی۔اُس کا لہجہ جو پہلے نرم اور قائل کرنے والا تھا واضح طور پر تبدیل ہو کر ناراضگی کا اظہار کرنے لگا اور کہا''آپ نے میرے احساسات کو مجروح کیا ہے۔''خوش قسمتی تھی کہ اُس نے بحث وتکرار اور جھگڑا شروع نہیں کیا کیوں کہ اُسے ایسا کرنے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

14

چمن لال کے گھر میں

اب تقریباً روزانہ ہی فوجی ہمارے بنگلے پر جو پہاڑی کے نیچے تھا آنے لگے، جو اندھیرا چھانے کے بعد اگلے محاذوں پر چلے جاتے تھے۔ ایک روز تقریباً رات کے دس بجے مولوی کی دونوں بیٹیوں نے وینا اور دوسری لڑکیوں سے کہا کہ موسیقی سننے کے لیے اُن کے ساتھ چلیں۔ ایک تنگ کمرے میں مسلسل قید رہنے سے اِنسان بالکل تنگ آجاتا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت تھم گیا ہے، جیسے وقت باسی ہو چکا ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل کے واقعات کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنے کی صلاحیّت ختم ہو جاتی ہے۔ میری بیٹیاں بھی شدت سے چاہتی تھیں کہ کوئی موقع ملے جس کے ذریعے وہ اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں، اس لیے فوراً رضا مند ہو گئیں۔ مجھے اُس وقت یہ نہ سوجھی کہ میں اُن سے پوچھ سکوں کہ موسیقی کہاں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ دراصل کوئی تین سو فوجی ہمارے بنگلے کے قریب خیمہ زن تھے۔ وہ اگلے محاذوں پر جا رہے تھے اور اس سلسلہ میں رات کے کھانے کے بعد گانے وغیرہ گا رہے تھے۔

لڑکیاں کچھ وقت تک تو باہر کی طرف دیوار سے لگ کر موسیقی سنتی رہیں اور بعد میں گھومنے کے لیے ایک نزدیکی کھیت کی طرف چلی گئیں۔ کچھ قبائلیوں کا وہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے ''وینا'' کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کی تو اُس نے زور سے چلّا کر کہا۔ ''دیکھو! قبائلی آرہے ہیں۔'' اس طرح وہ قبائلیوں کو دھوکہ دے کر گرتی پڑتی واپس گھر آگئیں۔ مولوی کی چھوٹی بیٹی بھی اُن کے ساتھ واپس آگئی لیکن بڑی کو ایک قبائلی نے دبوچ لیا۔ یہ لڑکی بھی آسانی سے بچ کر واپس آسکتی تھی کیوں کہ اس کا گھر وہاں سے بہت قریب تھا۔ شاید فوری خوف نے اُسے مفلوج کر دیا جس کی وجہ سے اُس نے بچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ''میں ایک مسلمان لڑکی ہوں، مجھے جانے دو۔'' اُس نے چلّا کر کہا۔ اُس نے اپنے دعوے کے حق میں کلمہ بھی پڑھا لیکن شہوت پرست قبائلی مذہب کو بھی اپنی خواہش کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ''تم ایک کافر کی بیٹی ہو۔'' اُنھوں نے اصرار

کیا۔اسی اثنا میں اُس کا ایک بھائی اور چچا جو قریب ہی رہتے تھے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔لیکن اُن کی منت سماجت بھی کسی کام نہ آئی اور لگتا تھا کہ قبائلی سپاہیوں نے اپنی خواہش کی تسکین کا فیصلہ کر رکھا ہے۔کسی نے دوڑ کر مسجد میں مولوی کو اطلاع دی جو لڑکھڑاتا ہوا دوڑ بھاگ کر کے مقام ابہام (موقعہ واردات) پر پہنچ گیا۔اُس نے کہا۔"یہ میری بیٹی ہے اور میں پکا مسلمان ہوں۔"اُس کی آواز پُرسکون اور ہموار تھی لیکن دیکھنے والوں کے قریبی دائرے کے علاوہ کسی کو سنائی نہیں دی۔اس وقت اُس کی آواز میں روایتی کھنک اور جارحانہ مذہب پرستی نہیں تھی۔شاید اپنے قابلِ فخر عقیدے کو ایک معمولی سے ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنے سے اُس کی انا مجروح ہو رہی تھی۔قبائلیوں نے لڑکی کو تو چھوڑ دیا لیکن واپس جاتے ہوئے آوارہ نگاہوں سے اور غیر تسکین شدہ خواہش اور کم ظرف شکست خوردگی کے عالم میں دیکھتے رہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مذہبی ہم آہنگی بھی خواہشوں کو کچلنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔اس کیفیت نے خواہش کی تسکین کے لیے اُن کی گمراہ کن جذباتیت کو مزید پستی میں اُتار دیا۔

جب لڑکی واپس گھر آئی تو اُس کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور چیخنے چلانے لگی جس کی وجہ سے اُس کی ناک بہنے لگی اور وہ اپنے شوہر کے خلاف مغلظات بکنے لگی۔وہ اُسے ہر طرح سے لعنت ملامت کرتی تھی اور غراتے ہوئے کہتی تھی۔"تم نے ہی ہندوؤں کو اس گھر میں بسانے کا فیصلہ کیا تھا۔اسی لیے میری بیٹی کو آج یہ بُرا دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔"

مولوی کی بیوی کے لیے ہمارا وہاں ٹھہرنا ہمیشہ ہی سے ناگوار رہا ہے اور جب ایک مصیبت آئی تو وہ اپنے مؤقف کو کیش کروانے پر تُل گئی۔مولوی اپنی نک چڑھی بیوی کی مداخلت سے بیزار تھا اور اُس کے سخت خلاف تھا کیوں کہ وہ اس وقت بے ضرر خود ترحمی (Self pity) کے احساس سے محظوظ ہونے کی طرف مائل تھا۔

تاہم اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس کے سامنے قصوروار سمجھتی تھی۔اس کے رنج وغم کا جواز بھی موجود تھا کیوں کہ اگر ہم وہاں نہ ہوتے تو شاید اُنہیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔میرے لیے اُس کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کرنا پریشان کن تھا اس لیے میں نے محتاط طریقے سے بات شروع کی۔"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کی بیٹی واپس آگئی ہے۔میں جانتی ہوں کہ ہم لوگ آپ سب کے لیے مصیبت کا باعث بن رہے ہیں۔میں ایک یا دو دن میں اس گھر سے کہیں اور منتقل ہونے کا انتظام کرلوں گی۔"

میں نے خان کو پیغام بھیجا کہ میں اُسے ملنا چاہتی ہوں اور وہ پہنچ گیا۔میں نے اُسے اس خواہش سے کہ میں مولوی کا گھر چھوڑنا چاہتی ہوں، آگاہ کیا۔میں نے اس بارے وزیر (ڈپٹی کمشنر) سے بھی بات کی

لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اس تجویز پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ وہ مُصر تھے کہ میں وہیں رہوں۔ لیکن اس کی کئی اور وجوہ بھی تھیں جن کے سبب میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مولوی ڈاکٹر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں باتیں نہ کرتا ہو۔ مجھے ڈاکٹر پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا اس لیے میں حیران تھی کہ مولوی ڈاکٹر سے کیا باتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے مولوی کی خیر خواہی پر شک ہونے لگتا تھا۔

ایک روز پروفیسر مقبول مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اب وہ نئی انتظامیہ میں آفیسر کے عہدے پر تعینات ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''مسز مہتا! آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ہمارے صدر ابراہیم آپ کی حمایت کے لیے آپ کے پاس آئے۔''

''اِس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''آپ اپنا مقابلہ ہندوستان میں اُن مسلمان عورتوں سے کریں جنہیں برہنہ کر کے جلوس نکلوایا گیا۔ آپ کے ساتھ کبھی ایسا سلوک تو نہیں ہوا۔''

میں دلیل بازی میں اُلجھنے کے لیے فکر مند اور بے قرار نہیں تھی۔ میرے پاس چونکہ کرنے کو کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں اکثر فارغ رہتی تھی اور اس طرح میں قدرے دروں بینی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کے ساتھ تفصیلی مکالمہ کیا۔ ''مجھے یہ سُن کر بہت صدمہ پہنچا ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو یہ شرم کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کہانی پر یقین رکھتی ہوں کہ ننگی عورتوں کو بھرے بازار میں مارچ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو میں اُن کے احساسات کو سمجھتی ہوں کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ جب آپ خود دکھ درد کا شکار ہوں تو دوسروں پر اسی طرح آسانی سے رحم آتا ہے جس طرح اپنے آپ پر۔ جب دُکھ درد کا موسم قربت اور ذاتی حیثیت اختیار کرتا ہے تو یہ جانا پہچانا سا بھی لگنے لگتا ہے اور پھر انسان اس کو اتنی آسانی سے سمجھ جاتا ہے جتنا اُس نے پہلے کبھی نہیں سمجھا ہوگا۔ جب آپ دوسروں کے مصائب پر عمومی (باہر سے ہو کر) نظر ڈالتے ہیں تو ہمدردی کے جذبات کم از کم جزوی طور پر ہی سہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ صرف واردات میں قلب و روح کی بھرپور شمولیت کے باعث حساسیّت کی نشوونما ہوتی ہے اور جذباتی ادراک اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب حساسیّت تیز ہو جائے۔ اور اگر آپ ہمیں اُس قسم کے جلوس میں لے جانا چاہتے ہیں تو میں ذاتی طور پر زیادہ دُکھ محسوس نہیں کروں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلسل دکھوں میں جسم اور روح مختلف طریقوں سے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ جسم پہلے پہل جُھرجُھری لیتے ہوئے اینٹھتا ہے لیکن بالآخر درد خود مزاحمت کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک حد تک چلنے کے بعد روح جسم سے فاصلے پر ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو جسم

لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اس تجویز پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ وہ مُصر تھے کہ میں وہیں رہوں۔ لیکن اس کی کئی اور وجوہ بھی تھیں جن کے سبب میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مولوی ڈاکٹر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں باتیں نہ کرتا ہو۔ مجھے ڈاکٹر پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا اس لیے میں حیران تھی کہ مولوی ڈاکٹر سے کیا باتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے مولوی کی خیر خواہی پر شک ہونے لگتا تھا۔

ایک روز پروفیسر مقبول مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اب وہ نئی انتظامیہ میں آفیسر کے عہدے پر تعینات ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''مسز مہتا! آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ہمارے صدر ابراہیم آپ کی حمایت کے لیے آپ کے پاس آئے۔''

''اِس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''آپ اپنا مقابلہ ہندوستان میں اُن مسلمان عورتوں سے کریں جنہیں برہنہ کر کے جلوس نکلوایا گیا۔ آپ کے ساتھ کبھی ایسا سلوک تو نہیں ہوا۔''

میں دلیل بازی میں اُلجھنے کے لیے فکرمند اور بے قرار نہیں تھی۔ میرے پاس چونکہ کرنے کو کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں اکثر فارغ رہتی تھی اور اس طرح میں قدرے دروں بینی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کے ساتھ تفصیلی مکالمہ کیا۔ ''مجھے یہ سُن کر بہت صدمہ پہنچا ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو یہ شرم کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کہانی پر یقین رکھتی ہوں کہ ننگی عورتوں کو بھرے بازار میں مارچ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو میں اُن کے احساسات کو سمجھتی ہوں کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ جب آپ خود دکھ درد کا شکار ہوں تو دوسروں پر اسی طرح آسانی سے رحم آتا ہے جس طرح اپنے آپ پر۔ جب دُکھ درد کا موسم قربت اور ذاتی حیثیت اختیار کرتا ہے تو یہ جانا پہچانا سا بھی لگنے لگتا ہے اور پھر انسان اس کو اتنی آسانی سے سمجھ جاتا ہے جتنا اُس نے پہلے کبھی نہیں سمجھا ہوگا۔ جب آپ دوسروں کے مصائب پر عمومی (باہر سے ہو کر) نظر ڈالتے ہیں تو ہمدردی کے جذبات کم از کم جزوی طور پر ہی سہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ صرف واردات میں قلب و روح کی بھرپور شمولیت کے باعث حساسیّت کی نشوونما ہوتی ہے اور جذباتی ادراک اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب حساسیّت تیز ہو جائے۔ اور اگر آپ ہمیں اُس قسم کے جلوس میں لے جانا چاہتے ہیں تو میں ذاتی طور پر زیادہ دُکھ محسوس نہیں کروں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلسل دکھوں میں جسم اور روح مختلف طریقوں سے ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ جسم پہلے پہل جُھرجُھری لیتے ہوئے اینٹھتا ہے لیکن بالآخر درد خود مزاحمت کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک حد تک چلنے کے بعد روح جسم سے فاصلے پر ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو جسم

کے درد سے غذا فراہم کرنے لگتی ہے۔اپنے آپ پر رحم کھانا اچھی بات ہے اگر چہ یہ خود ترحمی اُس امن وسکون کا کوئی مناسب متبادل نہیں ہے جو صرف حقیقی اور جائز حرکت، سرگرمی اور عمل سے مل سکتا ہے۔''

پروفیسر نے میری باتیں صبر وضبط سے سُنیں اور وہ اپنی خیر خواہی کا یقین دلانے کے بارے فکر مند رہا۔''براہ مہربانی میری بات کو دل میں جگہ نہ دیں۔مجھے اس واقعہ کا ذکر کرنے پر افسوس ہے۔آخر کار آپ کا بہت کچھ میری طرف واجب الادا ہے اور میں آپ کی مہربانی کیسے بُھلا سکتا ہوں؟ آپ نے اُس وقت میری ماں کا خیال رکھا جب میں یہاں سے دُور تھا۔وہ رات کس قدر خوفناک تھی؟''

''اوہ!جو کچھ میں نے کیا وہ ایک اچھا لیکن معمول کا برتاؤ تھا جو میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ضرور کرتا۔مہربانی فرما کر اس کا ذکر نہ کریں اس سے مجھے پریشانی ہوتی ہے۔''

ایک روز مولوی میرے پاس آیا اور تجویز پیش کی۔''میں آپ کو راولپنڈی بھیجنے کے انتظامات کر رہا ہوں۔آپ وہاں اُس وقت تک آرام سے رہ سکتی ہیں جب تک سارے معاملات واضح نہیں ہو جاتے۔''

میں نے زور دے کر جواب دیا کہ۔''میں کہیں اور نہیں جاؤں گی۔میں اُمید کرتی ہوں کہ میں بہت جلد چمن لال کے گھر منتقل ہو جاؤں گی۔''ظاہر ہے کہ وہ واقعات کی اس طرح تبدیلی نہیں چاہتا تھا،اس لیے کچھ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔خان نے مجھے نصیحت کی ہوئی تھی کہ اگر میں گھر تبدیل کروں تو اُسے مطلع کر دوں تا کہ وہ میری حفاظت کر سکے۔تاہم میں اُسے اپنے منصوبے کے بارے بتانا نہیں چاہتی تھی۔اندھیرا زیادہ ہونے سے قبل میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو چمن لال کے گھر بھیج دیا اور اُس کے فوراً بعد ہم سب بھی وہیں چلے گئے۔

اب ہمارے پاس ایک صاف سُتھرا کمرہ تھا جو صرف ہمارا تھا۔اگر چہ یہ گھر حملہ آوروں کے ہاتھوں لُٹ چکا تھا لیکن یہ جلنے سے بچ گیا تھا۔سارے سامان میں سے جو کچھ بچ سکا تھا وہ چند ٹوٹے پھوٹے برتن تھے یا ایک دو رضائیاں۔گھر میں دیگر لوگوں کے اوڑھنے کے لیے بوریوں کو سی کر بستر بنائے گئے تھے۔

چمن لال کو ایک بھاری کنبے کی کفالت کرنا تھی۔وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا اور اُس کی دو بہنیں تھیں۔اُن میں سے ایک شادی شدہ تھی اور اُس کا شوہر اور بچے بھی چمن لال کے ساتھ ہی رہتے تھے۔اُس نے کئی ہندو لڑکیوں کو بھی پناہ دے رکھی تھی جو دن کے وقت اُس کے تہہ خانے کے سیلز (Cells) میں رہتی تھیں۔صحن میں اُن محتاج کنبوں کے لیے خیمے لگا رکھے تھے جن کے لیے گھر میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔راتیں خوفناک حد تک سرد تھیں اور اِن خیموں میں زندگی بے حد مشکل تھی۔

چمن کا گھر شہر کے وسط میں واقع تھا اور یہاں لوگوں کو مستقل خطرے کا سامنا تھا کہ حملہ آور بچے کھچے

سامان کولوٹنے کی غرض سے کثرت سے اس علاقے میں گھومتے رہتے تھے۔ چمن کا والد نانک چند ایک نقل نویس تھا اور کسی وقت خاصا دولت مند بھی تھا۔ لیکن اب وہ ذلت آمیز غربت کا شکار تھا۔ چونکہ اُس کے سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اس لیے مقامی مسلمان بھی وقتاً فوقتاً اُس کی مدد کر دیتے تھے۔ گھر میں حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے زندگی اور بھی مشکل ہو رہی تھی۔ ہم باہر جانے سے ڈرتے تھے اور جب کبھی رات کے وقت ہم ہمت کر کے باہر نکلتے تو جلے ہوئے گھروں کی تاریک شکلیں خوف کی حس میں مزید اضافہ کر دیتی تھیں اور ہم آگے پیچھے دیکھتے ہوئے چلتے جاتے تھے لیکن پھر بھی ہماری تھکی ہوئی آنکھیں منڈلاتے ہوئے دشمنوں کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ رات کی ایسی دھمکی آمیز خاموشی میں ہمارے دل تیزی سے ڈھڑکتے تھے اور ہمارے کان گرج دار اعلانات سے بہرے ہونے لگتے تھے جو ایسے قریب الوقوع خطرے کے بارے ہو رہے ہوتے تھے جو کافی عرصے سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ خطرہ بذاتِ خود اپنا خوف ضائع کر چکا تھا لیکن سانس روک روک کر اُس ناگزیر آخری لمحے کا انتظار ہمیں تھکائے دے رہا تھا۔ ہم میں سے اکثر مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت سے محروم ہو چکے تھے۔ ہم کسی آخری اور قطعی لمحے کے منتظر تھے جو ہماری آزادی کا واحد ذریعہ بن سکتا تھا۔

وہ مہاجرین جو قتل عام (Holocaust) سے بچ گئے تھے ہر جگہ پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس جسم ڈھانپنے کو پھٹے پرانے کپڑوں اور بوریوں کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کچھ وقت کے بعد پاکستانیوں نے ہمیں تھوڑا تھوڑا راشن دینے کا فیصلہ کیا۔ خوشحال گھرانوں کے بچے پھیری (خوانچہ فروشی) کرتے ہوئے باہر جاتے تھے اور دو چار آنے کما لیتے تھے لیکن شہر کے مسلمان بمشکل ہی اُن سے کوئی چیز خریدتے تھے۔ اگرچہ کئی مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ہندو بھی ہماری ریاست کے شہری ہیں اس لیے انہیں خوفزدہ نہ کیا جائے لیکن اس زبانی خیر خواہی کا کوئی ٹھوس عملی ثبوت دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک گوردوارہ تھا جس میں بہت سی وہ خواتین رہ رہی تھیں جن کے شوہر ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ کبھی کبھی قبائلی وہاں آتے اور اپنی پسند کی کسی بھی عورت کو اُٹھا کر لے جاتے۔ اگرچہ وزیر (ڈپٹی کمشنر) نے اُن پر گارڈز مقرر کر رکھے تھے لیکن حملہ آور کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اب انتظامیہ معمول کے مطابق کام کرنے لگی تھی پھر بھی کسی قسم کے نظم وضبط اور قانون کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

دو دن کے بعد خان مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اُس نے کہا۔ ''میں نے سمجھا تھا کہ میں ہمیشہ آپ پر مہربان رہا ہوں لیکن شاید آپ کو میرے بارے بھی شک ہے۔ ورنہ آپ مجھے بتائے بغیر مولوی کا گھر تبدیل نہ کرتیں؟ لیکن پھر بھی میں آپ کی عزت کرتا ہوں جب تک میں یہاں ہوں تو آپ کے لیے جو کچھ کر سکا ضرور

کروں گا۔''

میں نے اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے ہوئے جواب دیا۔''ہاں، مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ مجھے گھر تبدیل کرنے سے قبل آپ کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔''

میں نے فوری طور پر اپنا چاقو نکالا اور ایک انگلی کی لو میں چاقو چھو کر خون نکالا جس سے اُس کی پیشانی پر تلک کا نشان بنایا۔ اس کے بعد میں نے اُس کی ہتھیلی کے گرد ایک دھاگہ باندھا جو''راکھی'' کی علامت تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے اُسے منہ بولے بھائی کی حیثیت دے کر اُس کی یہ ذمہ داری شکریہ کے ساتھ قبول کرلی ہے، جو وہ میری حفاظت کے سلسلہ میں کر رہا تھا۔

یہ بات بے حد حیرت انگیز تھی کہ راکھی اور تلک اگرچہ ہندوانہ رواج تھے لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ جب بھی یہ کسی مسلمان کو محبت کی علامت کے طور پر پیش کیے جاتے تو وہ بہر حال بہت شکر گزار ہوتا۔ وہ یہ محسوس کرتے کہ اُسے ایک ایسے رشتے میں تسلیم کیا گیا ہے جس کی ہندو ایک مذہبی اصطلاح کے طور پر جزوی طور پر ہی قدر کرتے ہیں۔

وہ بیٹھ گیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ میں اُسے اپنے تجربات کے بارے کچھ بتاؤں۔ میں اُسے بتا رہی تھی کہ کس طرح میں نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے کانوں کی بالیاں اُتار کر ایک نگران پارٹی (Escort) کے حوالہ کیں۔ خان نے اصرار کیا کہ میں نے وہ کس کو دی تھیں کیوں کہ وہ قسم اُٹھا رہا تھا کہ وہ اُس سے واپس لا کر دے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی اس لیے میں نے اُس کرائے کی نگران پارٹی کی شناخت کو بے نقاب کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے انکار سے خان ناراض ہو گیا اور وہ یہ کہتے ہوئے واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا کہ''پھر ٹھیک ہے، مجھے مت بتائیں۔ میں خود اُس کا پتا لگا لوں گا۔''

جب وہ واپس جا رہا تھا تو وہ نانک چند کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لیے رُکا۔''آپ کی بہت مہربانی کہ آپ نے بہن جی کو اپنے گھر میں رکھا ہے اور آپ کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہا ہے۔ میں اِس کو یاد رکھوں گا۔ ہوسکتا ہے یہاں اور بھی ناخوش گوار اور غلیظ حادثے پیش آئیں۔ کیا آپ کے پاس کوئی ریوالور ہے؟ اگر آپ کے پاس ہے تو وہ مجھے دے دیں اور کچھ زیورات بھی۔'' مجھے پتا نہیں تھا کہ خان نے ریوالور کی بابت کیوں پوچھا ہے لیکن شاید وہ نانک چند کے بارے کچھ جاننا چاہتا تھا۔

بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔''مجھے خدشہ ہے کہ اس گھر میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ حملہ آور ہر چیز

لے جا چکے ہیں اور ہم لوٹ مار کے دس دن بعد اِس گھر میں واپس آئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو تلاشی کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ خان یہ سُن کر قدرے مطمئن ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ''مولوی نے شکایت کی ہے کہ آپ کا بیٹا کانگریس والوں کا آدمی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے سچائی معلوم ہو چکی ہے۔''

خان جلد ہی وہاں سے چلا گیا اور جب تک مظفر آباد میں رہا وہ بے حد مفید اور مددگار ثابت ہوا۔

15

ایک اور شہید

ہمارے کپڑے بوسیدہ اور پھٹے پرانے تھے۔ میری بیٹیاں پیوند لگا کر دھو لیتی تھیں لیکن لڑکوں کے پاس کپڑے تبدیل کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ کپڑا ایسا ملا جو میرے شوہر نے کسی وقت خیرات میں دینے کے لیے خریدا تھا۔ میں نے اسے باہر نکالا تاکہ اس سے پاجامے بنائے جائیں۔ خان نے ایک ٹیلر کو بلایا اور اُسے کہا کہ اس کپڑے کی شلواریں بنا دے۔ ہندو پاجامہ پہننے کے عادی تھے لیکن اب وہ قبائلیوں کے خوف سے شلواریں پہننے پر مجبور تھے۔ شلوار میں مسلمان سے ہندو کو الگ کرنا ذرا مشکل تھا۔ میں تو ویسے بھی شلوار کے خلاف نہیں تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ میرے بیٹے زندگی کے لیے اور موت کے خوف سے شلوار پہنیں کیوں کہ اس کے مضمرات بہر حال یہی تھے کہ اُنہوں نے اپنی مرضی اور رضا کے خلاف منافقانہ طریقے سے ایک ایسے عقیدے کو قبول کر لیا ہے جو اُن کا اپنا انتخاب نہیں ہے۔ میں نے ٹیلر کو بتایا کہ وہ پاجامے بنا کر دے۔ جب وہ تیار ہو گئے تو خان نے بل ادا کر دیا۔

میں ایک روز بالکل تنہا اور خالی الذہن بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک خان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں چونکہ استغراق کے عالم میں محو تھی اس لیے مجھے خلل اندازی محسوس ہوئی۔ خان نے پوچھا۔ ''آپ اس قدر اداس کیوں ہیں۔''

''اچھا، میں اپنے شوہر کے بارے سوچے بغیر نہیں رہ سکتی اور میرے پاس ایسی کوئی یادگار بھی نہیں ہے جس کے ذریعے میں اُسے یاد کر سکوں۔''

وہ فوراً وہاں سے چلا گیا اور جلد ہی میرے شوہر کی ایک قمیض جو دھوبی کے پاس تھی لے کر واپس آ گیا۔ میں یہ قمیض دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔

بعد میں ایک روز خان میری بالیاں لے کر آ گیا۔ آخر کار اُس نے حسب وعدہ اُنہیں تلاش کر ہی لیا۔ اُس نے چمن کی ماں سے کہا کہ وہ مجھے بالیاں واپس لینے کے لیے قائل کرے۔ میں اس بارے بضد تھی کہ

میں وہ واپس نہیں لوں گی اور بالاصرار خان سے کہا کہ وہ یہ بالیاں اُسی آدمی کو واپس کرے جس سے وہ لے کر آیا ہے۔
خان بہت ناراض ہوا لیکن غصّے کا اظہار کیے بغیر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں فی الفور اُس کو واپس کردوں گا۔''

وہاں سوائے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے اور کوئی کرنے کا کام نہیں تھا اور ایک ایک دن ہماری پوری زندگی کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ واحد خبر جس نے معمول کے کاموں کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا اور ہمیں ایک نئے صدمہ سے دوچار کیا، وہ مسٹر مودی کا انتقال تھا۔ اطلاع کے مطابق اُس کی لاش ایک نالے میں پڑی ہوئی تھی۔ چمن نے لاش تلاش کرنے کے لیے ایک گروپ منظّم کیا اور بالآخر اُس کو مل گئی۔ مسٹر مودی کی لاش اس نالے میں ہفتوں پڑی رہی لیکن تعجب ہے کہ نہ وہ بوسیدہ ہوئی اور نہ ہی اُس سے بُو آنے کی شکایت ملی۔ وہ انہی پرانے کپڑوں میں تھا۔ اُس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک معمولی سی حیرت کے آثار تھے لیکن اس کے علاوہ مکمل امن، اطمینان اور خود سپردگی۔ اس خیال سے مایوسی ہوئی کہ انسان زندگی بھر جس توازن اور یکسوئی کی تلاش میں رہتا ہے وہ کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ وقت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنی زندگی میں رُونما ہونے والے حوادث کے خلاف دردناک شعور کے ساتھ ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں اور شعلہ بار دانش کی مدد سے اُس کا تجزیہ کرتے ہیں لیکن ہم ہمیشہ اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انجام بالآخر عقل ودانش کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی دانشوری اور جسمانی نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے۔ جب کبھی ہمیں توازن کا احساس ہوتا ہے یا اس طرح کی کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو یہ کسی مدھم سے سمجھوتے کا نتیجہ ہوتا ہے جہاں انسان کے پاس صرف سکڑی ہوئی اور ناراض خودی رہ جاتی ہے۔

میں نے مسز مودی کو بتایا کہ میں وزیر کو خط لکھ رہی ہوں کہ وہ ہمیں چتا کے لیے ایندھن فراہم کرے۔ دوسرے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں اُسے خط لکھوں۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان چتا جلانے کے موٴقف کو پسند نہیں کریں گے اور اس سے متفق بھی نہیں ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقدام اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ہمیں پتا چل جائے گا کہ وزیر کس حد تک ہماری مدد کے لیے تیار ہے۔ بہرحال اُس نے بہرحال ہمیں پانچ من ایندھن کی منظوری دے دی۔ لیکن ہم اپنے مسلمان ہمسایوں سے خوف زدہ تھے کہ کیا وہ بھی ہمیں اس رسم کی ادائیگی کرنے دیں گے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ اُس کی لاش کو کشن گنگا میں بہادیا جائے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کیسے قتل ہوا۔ جب حملہ آوروں نے اُس کے بنگلے پر حملہ کیا تو اس کا اکیس سالہ بیٹا گھر کے اندر تھا۔ مسٹر مودی اپنی بیوی کملا اور دو ملازمین کے ساتھ ایک مشہور ہندو کے ہاں پناہ

لینے شہر گیا ہوا تھا۔ مسٹر مودی کے ساتھ سیکڑوں دیگر لوگوں نے بھی اُسی محل میں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ اُس کی بیوی اور بیٹی محفوظ ہیں مسٹر مودی اپنی بندوق لے کر باہر نکل آیا۔

ایک مسلمان جو مظفر آباد کے نزدیک ہی ماکڑی میں رہتا تھا مسٹر مودی کے اس لیے خلاف تھا کہ اُس نے ایک مرتبہ سڑکوں کی تعمیر سے متعلق اُس کا ایک بل پاس نہیں کیا تھا۔ اب کسی طرح موت اُس کو اُسی مسلمان کے دروازے پر لے گئی۔ اس شخص نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مسٹر مودی کو قتل کیا اور اُس کی لاش کو اُس نالے میں پھینک دیا جہاں سے اب وہ چمن لال کو مل گئی۔ جب مسٹر مودی واپس نہیں آیا تو اُس کے خاندان والوں نے دو تین دن تک اُسی گھر میں رہ کر اُس کا انتظار کیا، جہاں وہ اُنہیں چھوڑ گیا تھا۔ مکان پر بالآخر حملہ آوروں نے حملہ کر ہی دیا اور زیادہ تر مردوں کو پکڑ کر لے گئے۔ جو خواتین وہاں رہ گئی تھیں اُن کے پاس پینے کے لیے پانی تک نہیں تھا اور جب اُن کے بچے پیاس سے بلبلا کر پانی کے لیے چیخنے لگے تو خواتین نے اُن کے درد کو برداشت نہ کرتے ہوئے اُنہیں پینے کے لیے پیشاب دیا۔

اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے پاکستانیوں نے ریاست کی حکومت اور ہندو زمین داروں کی جائیداد کو نیلام کیا۔ چند ہندو جو یہاں باقی رہ گئے تھے بالکل بے اختیار تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے گھر اور باغات آسانی سے مسلمانوں کو منتقل کر دیے گئے۔

حملہ آوروں نے ہمارے گھر کے سامنے سے اُوپر اور نیچے جانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ میرے چھوٹے بیٹے ویمل نے اُن سے لڑنے کے لیے بچوں کی ایک فوج کھڑی کی۔ اُس نے دوسرے بچوں کو بتایا کہ تیر اور کمان سے کیسے لڑا جاتا ہے اور جب کبھی وہ حملہ آوروں کے کسی گروپ کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتا تھا تو وہ کھڑکی سے ہو کر انہیں بے خوفی سے دیکھتا رہتا۔ وہ اپنے ''سپاہیوں'' کو بتاتا تھا کہ اُنہیں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہیے کیوں کہ یہ بزدلی کی علامت ہے۔ گھر کے دوسرے افراد ویمل کو چھیڑتے ہوئے کہتے تھے۔ ''جب تک تم زیادہ نہیں کھاؤ گے تو حملہ آوروں کے خلاف کیسے لڑو گے۔ آیئے دیکھیں کہ تم یہ سب روٹیاں کھا سکتے ہو۔'' ویمل اُن کا چیلنج قبول کرتے ہوئے اتنی روٹیاں کھا لیتا تھا جو اُس کی عمر کے لڑکے دو دنوں میں کھاتے ہیں۔ پھر وہ تیزی سے تین گلاس پانی پیتا تھا اور اپنے تئیں ہر ممکن یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر دکھائی دے۔

فارسٹ رینجر دوبارہ میرے پاس آیا اور شاید اس مرتبہ وہ مجھے خوفزدہ کرنے آیا تھا کیوں کہ اس مرتبہ اُس کے پاس رائفل اور راؤنڈز بھی تھے۔ بڑی ہمدردی سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''مجھے آپ کا افسوس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی مدد کروں۔ کیا آپ میرے ساتھ آئیں گی۔ میرے پاس دو سو

راؤنڈز اور ایک سو پچاس روپے بھی ہیں۔ میرے راستے میں کوئی نہیں آ سکتا۔"

میں نے قریب سے ہو کر اُس کے چہرے کا جائزہ لیا جو جنسی جذبات سے لبریز تھا۔ میری غور طلب نگاہ کی وجہ سے وہ کھسیانا سا ہو گیا اور اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں نے کہا۔ "ایک مجھے فکر کو سوچنے کے لیے میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی مجھے اِس کے بارے سوچنے دیں اور ہو سکتا ہے کہ میں بعد میں کسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔"

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ اُسے میرا جواب کیسا لگا ہے اُس کی طرف دیکھا لیکن اُس کا سر ابھی تک جُھکا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی بھلائی کے لیے ہے۔ آپ آج رات کو میری طرف آ رہی ہیں۔ میں ایک بس لے کر آپ کو لے جانے کے لیے آتا ہوں۔"

میں نے انکار کر دیا لیکن وہ میرا موٴقف سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے وعدہ کر لیا کہ وہ رات کو واپس آئے گا۔ جب وہ دُور چلا گیا تو ہندوستانی جہازوں نے دو میل پر بم باری کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا، لیکن وہ اُس کے بعد میرے پاس واپس نہیں آیا۔

خان حسبِ معمول بہت مہربان تھا۔ ایک دن اُس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مجھے وہ آدمی مل جائے جس نے مہتا صاحب کو قتل کیا ہے تاکہ اُس کی بیوی اور بچے بھی اِسی طرح مصیبت میں مبتلا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اُن کی غمی مجھے کیسے اطمینان دلا سکے گی؟ اس سے میرا درد کم نہیں ہو گا۔ نہیں، میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دوں گی کہ اگر وہ آدمی آپ کو مل بھی جائے تو آپ اُسے قتل کر دیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس سب کا قصوروار صرف اُسی کو ٹھہرانا درست نہیں ہو گا۔"

16

ایک دوست کی روانگی

ایک دن حملہ آوروں نے چند ہندو نوجوانوں کو ہسپتال آنے کو کہا۔لڑکوں کو بتایا گیا کہ اُن کا راشن وہاں سے تقسیم ہوگا۔ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کسی کو دو ہفتوں کے لیے اکٹھا راشن دیا گیا ہو،اس لیے راشن کی تقسیم کی اس پیشکش کو ہر لحاظ سے ایک اہم واقعہ سمجھا گیا۔قصبے میں کوئی بھی آدمی بلکہ ہزار میں سے ایک بھی حتیٰ کہ وہ بھی جسے یہ سازش لگ رہی ہو،وہاں نہ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

تاہم بعد میں یہ ایک سازشی جال ہی ثابت ہوا۔جب وہ ہسپتال پہنچے تو مسلح حملہ آوروں نے اُنہیں حیرت میں ڈال کر محصور کرلیا اور ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگالیا۔جب وہ گھنٹوں تک واپس نہ آئے تو اُن کے رشتہ داروں کو پریشانی ہوئی اور وہ یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہوا ہے ہسپتال چلے گئے۔لیکن وہاں اُنہیں بھی پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

نانک چند ہسپتال جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُسے اچانک راستے میں خان مل گیا۔خان نے اُسے واپس گھر بھیج دیا اور اُسے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں گھر سے باہر نہ آئے۔

دوسرے دن شہر پر ایک منحوس سی خاموشی چھائی رہی۔ہر شخص محتاط قدموں سے چل رہا تھا اور اُس کے چہرے پر دکھ اور افسوس دکھائی دیتا تھا۔وہ یہ احساس دلاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ اب وہ اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھتے تھے جیسے اُن کے چہروں پر غمناک سنجیدگی اور بے حسی چھائی ہوئی ہو۔لیکن کسی قسم کا اظہار نہیں کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خوف مشترک ہے۔اس کے باوجود کہ وہ باتیں کرتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے لیکن خاموش سرگوشیاں پھر بھی ہر طرف گھوم جاتی تھیں۔

مجھے جس بات کا علم نہیں تھا وہ پہلے ہی خبر کی شکل میں پھیل چکی تھی۔مجھے اس کے بارے کئی گھنٹے بعد معلوم ہوا۔وہ ہندو جنہیں ہسپتال میں قید کیا گیا تھا اُن سب کو گذشتہ شب بڑی بے وردی سے قتل کر دیا گیا۔مقامی

مسلمانوں نے یہ کہانی تفصیل سے سُنائی کہ انہیں کس طرح قتل کیا گیا۔ وہ سارے تقریباً ساٹھ کے لگ بھگ تھے۔ اُنہیں یخ بستہ سردرات میں ننگا کر کے باہر کھڑا کیا گیا اور کہا گیا کہ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ پھر سب کو کلمہ پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ قطار کے پیچھے ایک قبائلی خاتون انتہائی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی اور جب اُس کے سامنے والا شخص کلمہ پڑھ چکتا تھا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اور دانت کچکچا کر خنجر پورے زور سے اُس کے دل میں اتار دیتی تھی۔ میں آسانی سے اُس عورت کے چہرے پر مذہبی فریضے کی ادائیگی سے حاصل ہونے والے اطمینان کا تصوّر کر سکتی تھی۔ کیوں کہ عالمگیر سطح پر دیگر جنونیوں کا شیوہ بھی یہی رہا ہے جب تک کہ اسے حقیقی اور مدلّل سمجھا جاتا رہا۔ انسانی خون کے منظر نے اُن کے احساس کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ اب وہ اپنی خود فریبی کو بھی پوری طرح فراموش کر بیٹھے تھے۔

قتل ہونے والوں میں سے ایک آدمی چمن لال کے اس گھر میں رہتا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اور جب اُس کی بیوی نے یہ خبر سُنی تو اُسے یقین نہیں آیا۔ اُسے موقعہ واردات پر لے جایا گیا تا کہ وہ خود دیکھ سکے کہ کیا ہوا ہے اور اُس کی شہادت شک و شبہ سے بالا تھی۔

اُسی دن دوپہر کو خان مجھے ملنے آیا اور میں نے اُس سے اِس حادثہ کا ذکر کر دیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے اس کے بارے معلوم ہے۔ اُس نے سارے معاملے کو محض افسانہ قرار دے کر ٹھپ کر دیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اِس پر کیسے یقین کر سکتی ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ ''ایک خاتون جو اسی گھر میں رہتی ہے اس حادثے کو جسے اُس نے خود دیکھا ہے اور وہ اس ثبوت کو اپنی ساری زندگی یاد رکھے گی۔''

خان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگا ''اپنے ملازم سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ میں خود وہ لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ محض دلچسپ افواہیں ہیں۔'' خان کے ذہن میں ایک کشمکش تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ میں اُس وقت اُس سے یہ ذکر نہیں کر سکتی تھی جب تک مجھے اِس کی صداقت کا یقین نہ ہوتا اس لیے وہ اس حادثے کو بڑی سنجیدگی سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے قبل کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس معاملے میں اُسے انتخاب کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ وہ مجھے بھی جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس دردناک کہانی کے کسی بھی حصہ کا سامنا کرنا بھی اُس کے لیے مشکل تھا۔ وہ یہ وعدہ کر کے واپس چلا گیا کہ وہ دوبارہ شام کو آئے گا۔

وہ شام کو واپس آیا اور اُوم، جودھا اور چند دوسروں کو ساتھ لے کر حادثے والی جگہ پر گیا۔ تقریباً ایک

گھنٹے کے بعد وہ سارے واپس آ گئے اور خان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کس وجہ سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

اُس نے ملازموں کو میرے سامنے لایا اور کہا۔ ''اِن سے پوچھیں کہ اگر اِن کو وہاں کوئی چیز نظر آئی ہو۔'' جب میں نے اپنا رُخ ملازموں کی طرف کیا تو اُنہوں نے بھی کہا کہ انہیں کوئی چیز نہیں ملی۔ خان کے لیے صورتِ حال اچھی تھی اور اُس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''وہاں صرف خون کے چند قطرے تھے اور میں صبح اِس بات کا پتہ چلا لوں گا کہ وہ وہاں کیسے آئے۔''

دوسری صبح خان پھر آیا اور مجھے بتایا کہ اُس نے اُس پہاڑی کو دوبارہ دیکھا۔ اُس نے کہا یہ سچ ہے کہ وہاں وزیر کے حکم سے ایک آدمی کو قتل کیا گیا ہے اور کہانی یہ ہے کہ شیخ عبداللہ جو کشمیر کا وزیرِاعظم ہے، نے وزیر کے خاندان کے کچھ لوگوں کو قید کیا ہوا ہے اور انہیں اذیّت دلوا رہا ہے۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ ایک ہندو قیدی کو قتل کر کے وزیر نے جوابی کارروائی کی ہے۔

میں نے خان کو بتایا۔ ''اگر وزیر کے خاندان کے بارے کہانی سچ بھی ہو تو اُسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ یہاں ہندوؤں کو قتل کر کے اُن کی قسمت نہیں بدل سکتا۔'' تاہم خان نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اصل میں شیخ عبداللہ کی انتظامیہ ہی پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہندوؤں کی حالت زار کی ذمہ دار ہے۔ یہ میرے اور خان کے درمیان ایک پرانا جھگڑا تھا۔ میں اُسے کبھی قائل نہیں کر سکی کہ دو غلطیاں ایک دوسری کو کاٹ کر منسوخ نہیں کر سکتیں بلکہ ایک دوسری کے ردِّعمل میں غموں میں اضافہ کرتی ہیں۔

شہر میں تناؤ کی کیفیت کچھ یوں جاری تھی جیسے روشندان کے بغیر کمرے میں تعفن پھیلا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک اور حادثہ ہوا۔ ہندوؤں کو جلوس کی صورت میں مسجد لے جایا گیا اور اُنہیں کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ مذہب کی اِن جبری تبدیلیوں کی خبریں سُن کر قریبی گاؤں کے مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور انہیں اپنے گھروں میں پناہ دینے کی پیشکش کی۔

نانک چند بالکل اس حق میں تھا کہ ہمیں یہاں سے نکل کر کسی قریبی گاؤں میں پناہ لے لینی چاہیے۔ لیکن خان نے اُسے یقین دلایا کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گا۔

ہندو مسلسل اضطراب اور بے اطمینانی کا شکار تھے اگرچہ اُن سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو اُن کی زمینیں اور جائیدادیں اُنہیں واپس لوٹا دی جائیں گی۔ اوم بھی اس بات کے حق میں تھا کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اُس نے کہا کہ۔ ''یہ محض قسمت ہے کہ ہم اب تک بچے ہوئے ہیں لیکن یہ صورت حال

ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی۔'' تاہم وہ میری خواہشات کے احترام میں وہیں ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔

ایک پولیس آفیسر ایک دن گھر آیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اُس روز دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کلمہ پڑھنے کے لیے مسجد میں کیوں نہیں گئی تھی۔ آفیسر جانتا تھا کہ خان ہمارے ساتھ بہت ہمدردی رکھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں اُسے بتا دوں گی، جو میں نے اُسے بتا بھی دی۔

ایک دن جب خان بھی گھر میں موجود تھا ایک دوسرا پولیس آفیسر مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ اکثر میرا حال پوچھنے کے لیے آیا کرتا تھا لیکن آج خان کی موجودگی میں اُس نے بے آرامی سی محسوس کی اور زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ تاہم خان کے چلے جانے کے بعد وہ دوبارہ آیا اور کہا۔''شاید آپ کو احساس نہیں کہ یہ خان کتنا خطرناک آدمی ہے۔ یہی تھا جس نے چند دن پہلے آپ کے بنگلے میں قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں کبھی بھی اُس پر اتنا اعتماد نہ کرتا۔''

''لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ نے ہماری دیکھ بھال کے لیے کیا کیا ہے؟ ہمیں دن میں کتنی ہی بار بھاگ کر بند کمروں میں چھپنا پڑتا ہے۔ قبائلی حملہ آور دھرمسالہ کیمپ سے بھی عورتیں اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ خان ہی ہے جس نے یہاں ہمارا قیام ممکن بنایا ہے۔ میں اپنے بارے آپ کی فکرمندی کی قدر کرتی ہوں لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کھیل کھیل رہا تھا لیکن میں نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

پولیس آفیسر دراصل اس گھر میں خان کا سامنا کر کے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خان کے ساتھ اُس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ جب پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے حکام نے اس پولیس آفیسر سے مذہب کی جبری تبدیلی، ہندو خواتین کے اغواء اور اُن کے رشتہ داروں کے اَتا پتا کے بارے معلوم کیا تو اُس نے سارا الزام قبائلیوں کے ذمے تھوپ دیا۔ جب کہ پاکستانی آفیسر بھی اِن واقعات کے اتنے ہی ذمہ دار تھے جتنے کہ قبائلی۔ تاہم مظفر آباد کے مقامی مسلمان ہندوؤں کے خلاف دشمنی میں سرگرم نہیں تھے۔ بلکہ بعض اوقات مددگار بھی ثابت ہوتے رہے۔

ایک دن میں یہ سُن کر کہ خان مظفر آباد چھوڑ رہا ہے بہت بددل ہوئی اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔''مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسی چیز دیں جو میں گھر لے جاؤں تو آپ کی یاد دلاتی رہے۔'' میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ درخواست کرتے وقت اُس کے ذہن میں میرے شوہر کا ایک ''کھیس'' (Khes) تھا۔ میں نے اکثر اس کے بارے اُس سے بات چیت کی تھی

اور اُسے بتایا تھا کہ میں اُس کو سنبھال کر رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اب جب اُس نے مانگ ہی لیا تو میں انکار نہ کر سکی۔ میں اُن آنسوؤں کو بھی نہ روک سکی جو صبر وضبط کے بند توڑ کر بہہ نکلے جب میں نے وہ ''کھیس'' خان کے حوالے کیا۔ مجھے اپنے شوہر کا خیال آیا اور افسوس بھی ہوا کہ خان جا رہا تھا۔ اُس نے میری تصویر کی نقل بھی مانگی لیکن وہ میرے پاس نہیں تھی اس لیے میں نہ دے سکی۔ میں نے اُس سب کے لیے جو اُس نے ہمارے لیے کیا اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے کہا۔ ''میں نے آپ کو کئی بار کہا ہے کہ آپ میرے ساتھ کابل چلیں۔ وہاں سے آپ کو ہندوستان بھیجنا میرے لیے آسان ہو جائیگا لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔''

میں کبھی اس بات کی وضاحت نہیں کر سکی کہ شروع ہی سے خان نے میرے ساتھ اس قدر مہربانی کا سلوک کیوں روا رکھا۔ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسے آدمی کی نیکی جس سے اس کی توقع نہ ہو، حیران کر دیتی ہے اور ایک غیر معمولی اور مستقل انسانی رشتے کی بنیاد بن جاتی ہے۔ میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے کہ خان مجھ پر اس لیے مہربان تھا کیوں کہ وہ اپنی زندگی کے کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات اور حادثات کی یادوں کو جو اُس کے ضمیر کے لیے بوجھ بنے ہوئے تھے، پرے پھینک کر آسودگی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کبھی اپنی ذہنی کشمکش کے بارے مجھے نہیں بتایا۔ میں صرف اُس کا اندازہ ہی کر سکتی تھی۔ اُسے شاید اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں بعد میں اُسے ایسے اعتماد کے بارے پچھتانا نہ پڑ جائے جو کسی عاقبت نااندیش لمحے میں کیا گیا ہو، جس کے لیے اُسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ اُس کی سیاست اور اس کے نزدیک اس کی اہمیت کی وجہ سے میں اُس کے بارے زیادہ کچھ نہیں جان سکی۔

میں نے اُسے بتایا کہ جب میں قیدی ہوں تو میں بھاگ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ واقعی رہنا چاہتی ہیں تو میں آپ کے لیے اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' اُس نے کہا،

وہ دوسرے دن ایک نوٹس لے کر واپس آیا جو سُرخ سیاہی سے تحریر کیا ہوا تھا اور اُس کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:

''کوئی بھی شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اجازت کے بغیر اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ خلاف ورزی کرنے والے کو سارے قبائلی ایریا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

آغا جان خان

قبائلی لیڈر

قبائلی ہمیشہ سے مضبوط نسلی غرور اور وفاداری کے حامل رہے ہیں۔ سُرخ سیاہی خون کے رنگ کی ترجمانی کرتی تھی۔ اُس نے کہا۔ ''یہ نوٹس میری غیر حاضری میں آپ کی حفاظت کرے گا۔ یہاں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو نظر انداز کریں گے۔'' پھر وہ باہر گیا اور نوٹس کو دروازے پر چسپاں کر دیا۔ اب جب ہم نے اُس کے دستخط پڑھے تو ہمیں احساس ہوا کہ خان کتنا اہم آدمی تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے ہم سب کو فرداً فرداً الوداع کہا۔

پولیس آفیسر مجھے یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ خان ہی ہندوؤں کے قتلِ عام کا ذمہ دار تھا۔ جب وہ چلا گیا تو اصلی مجرم بھی دریافت کر لیے گئے۔ یہ راز کُھلا کہ ڈاکٹر اور اُس کے لوگ اس سارے قتل عام کے ذمہ دار تھے۔

اپنی روانگی سے ایک ماہ بعد خان نے مجھے لکھا:

''میری پیاری بہن جی! براہِ مہربانی میری طرف سے آداب قبول کریں۔ میں بحفاظت گھر پہنچ گیا ہوں اور ہمیشہ آپ کو اور آپ کے بچوں کو یاد رکھوں گا۔ خدا آپ پر رحم کرے۔

آپ کا مخلص

آغاجان خان،

بنوں۔ کوہاٹ

میں نے بھی اُسے واپسی خط لکھا لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ شاید ہمارے خطوط سنسر کی نذر ہوگئے۔ نوٹس جو اُس نے ہمارے دروازے پر چسپاں کیا تھا ہمارے لیے بُہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ کبھی کوئی گھر میں داخل نہیں ہوا۔ میرے مظفر آباد چھوڑنے کے بعد بھی بے شمار لڑکیوں نے اُسی گھر میں پناہ لی اور وُہ قبائلیوں سے محفوظ رہیں۔ بعد میں نانک چند اُن سب کو ہندوستان لے آیا۔

سویرے سویرے کے ملاقاتی

بسا اوقات ہمارے لوگوں کو گرفتار کرنے والے (Captors) بھی حیرت انگیز طور پر ہمدردی اور نرمی کا اظہار کرتے تھے۔ اگر اُن کے اسیر اُن کے بارے اچھے الفاظ کا استعمال کر دیں تو وہ اپنے آپ کو مزید بہتر بنانے کو کا سوچ سکتے تھے۔ اکثر لوگ جو دوسروں سے اچھے ہوتے ہیں تو وہ دراصل اپنی ذات کو مطمئن کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اُونچائی پر محسوس کرتی ہے۔ تاہم اُس میں نیکی اور اچھائی اور خالص فکرمندی کا عنصر بھی کافی حد تک موجود ہوتا ہے۔

راولپنڈی کے کسی کالج کے بہت سے لڑکے مہاجرین کی دیکھ بھال کی غرض سے مظفرآباد آئے اور کمبل اور کپڑے محتاجوں میں تقسیم کیے اور ایک پورا دن شہر کے ہر گلی کوچے میں گھوم پھر کر میٹھی روٹیاں تقسیم کیں۔

لوگ قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور بڑی رغبت سے لڑکوں کے ہاتھ سے روٹیاں چھین کر بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈال کر واپس آئے۔ اِن میں ایسے لوگ بھی تھے جو کبھی عام زندگی میں نہایت تکلّف سے کام لیتے تھے اور اگر کبھی کسی دوست کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمیشہ بھوک رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔

اُوم نے بھی قطار میں اپنے لیے جگہ بنالی اور یہ اعلان کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں واپس آیا کہ اُس نے پانچ روٹیاں لائی ہیں۔'' اُس نے فخریہ کہا۔ ''کوئی اور اتنی روٹیاں حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔''

مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے اُوم سے کہا کہ وہ دوبارہ جا کر روٹیاں واپس کرے۔ لیکن اُوم کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں اُس کی لامحدود خودغرضی میں حصہ دار نہیں بننا چاہتی تھی۔ اُوم نے مجھے وہمی سمجھا ہوگا اس لیے وہ واپس جاتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اُس نے روٹیاں واپس کرنے کا بُرا تو نہیں منایا تھا لیکن بجھ سا گیا کیوں کہ میں نے اُس کے اِس عمل کی تعریف نہیں کی جسے وہ خود ایک کارنامہ سمجھتا تھا۔

دوسری صبح میں نے اُوم سے کہا کہ وہ جودھا کو لے کر ہمارے پرانے بنگلے میں جائے۔ ''جاؤ اور باغ سے کچھ سبزیاں توڑ کر لاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بھی معلوم کرو کہ وہاں کون ٹھہرا ہوا ہے اور وہ لوگ کیا کر رہے

ہیں۔''اُوم اور جودھا باغ میں گئے اور جب وہ سبزیاں توڑنے میں مصروف تھے تو اُنہیں بلوچ رجمنٹ کے ایک سپاہی نے دیکھ لیا۔

اُس نے اُن سے پوچھا۔''تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو اور کس نے تمہیں بھیجا ہے؟''

''یہ کوٹھی پہلے ہمارے وزیر کے پاس تھی۔ اُسی کی بیوی نے ہمیں باغ سے سبزی لینے کے لیے بھیجا ہے۔''اُوم نے جواب دیا۔

سپاہی متجسّس ہو گیا۔''اُس کی کتنی بیٹیاں ہیں اور وہ کس عمر کی ہیں؟ وہ جاننا چاہتا تھا۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ لڑکیاں بہت چھوٹی ہیں تو وہ مایوس ہوا۔ اور اب وہ ملازموں کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا۔''اب فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور باہر جا کر کھڑے رہو۔ اگر تم نے یہاں دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو اپنی زندگی ختم سمجھو۔''اُس نے چلّا کر کہا۔

اُوم اب اس قسم کی دھمکیوں کا عادی ہو چکا تھا اور اس طرح واپسی کے راستے پر چلنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن جودھا خوفزدہ ہو گیا۔ اُوم کو معلوم ہوا کہ وہ چوکیدار جو پہلے اس بنگلہ پر کام کرتا تھا ابھی تک وہیں ہے اور انہوں نے آپس میں اس طرح گفتگو شروع کر دی جیسے وہ لمبی جدائی کے مارے ہوئے چچیرے بھائی ہیں۔ جودھا جس کی ماضی قریب کی یادداشت میں اتنی گپ شپ نہیں تھی، کھل کر گفتگو کرنے لگا اور سپاہی اور اُس کی دھمکیوں کو بالکل بھول گیا۔ عین اُسی وقت سپاہی واپس آیا اور اُس نے جودھا سے کہا کہ ایک آفیسر اُسے بُلا رہا ہے۔ جودھا کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی اور وہاں ٹھہر کر گپ شپ کرنے کے فیصلے پر افسوس کیا اور پھر فوراً اُسے آفیسر کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اُوم موقعہ غنیمت جان کر وہاں سے کھسک گیا۔

آفیسر کو شک گزرا کہ شاید جودھا کوئی ایسی قیمتی چیز لے جانے کے لیے آیا ہے جو میں نے گھر کے کسی کونے میں چُھپا رکھی ہے۔ اُس نے جودھا سے پوچھا۔''تم اجازت کے بغیر اس صحن میں کیوں داخل ہوئے؟ وہ آدمی جو تمہارے ساتھ آیا تھا اب کہاں ہے؟ اگر تم اس آدمی کو دریافت نہیں کرتے تو میں تمہیں گولی مروادوں گا۔''جودھا نے اُوم کو اُوپر نیچے ہر طرف تلاش کیا لیکن اُسے وہ نہ ملا۔

بالآخر وہ واپس گھر آیا اور سپاہی جو اُسی کے ساتھ آیا تھا گھر میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا، جیسے اُسے یہ سب کچھ عجیب اور انجانا محسوس نہیں ہوا۔ وہ بے تکلف ہو گیا اور برآمدے میں آ کر آگ کے پاس بیٹھ گیا، جہاں چمن کی والدہ اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ اُوم کو ساتھ لیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ جودھا نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ سپاہی کے قریب بیٹھ جائے تو اُس میں شاید سپاہی کا خوف کم

ہو جائیگا۔ پھر وہ اس خوف سے بچ جائیگا کہ اُس کے ساتھ کیا ہونیوالا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ سپاہی چمن لال اور اُس کے گھر والوں پر میری غلطی کی وجہ سے سوار ہو رہا ہے۔

ایک گھنٹے تک کسی نے کوئی بات نہ کی اور ہم بیٹھے رہے۔ اُوم واپس نہیں آیا۔ چمن کی ماں نے سپاہی کو واپس جانے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی اور اُس سے وعدہ کیا کہ اُوم جوں ہی واپس آجائے گا وہ اُسے اُن کے پاس بھیج دے گی۔ سپاہی نہ سننے کا بہانہ کر رہا تھا اور مسلسل آگ کے اندر گھور رہا تھا۔ وہ ایسی کھلی ہوئی آنکھوں کی یکسوئی سے گھور رہا تھا جیسے دُنیا اُس کی نگاہوں کے سامنے کسی خوبصورت تصوّر میں تحلیل ہو رہی ہو اور وہ اسے مسلسل اپنے ذہن میں جذب کر رہا ہو۔ ہم سب گھر کے اندر چلے گئے اور ایک چھوٹی سی کانفرنس کر ڈالی کہ کسی طرح سپاہی سے نجات حاصل کی جائے۔

چمن غصّے میں تھا اور بار بار پاؤں فرش پر پٹکتا تھا ''اِن دو بے وقوفوں کو دیکھو۔'' وہ چلّایا۔ ''محض دو آنے کی سبزی کی خاطر انہوں نے ہمارے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔'' دراصل غلطی میری تھی۔ سبزی تو محض ایک بہانہ تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے متجسّس تھی کہ ہمارے پرانے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

میں سپاہی کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ ''میں نے اِن دو ملازمین کو اپنے باغ سے سبزی چننے کے لیے بھیجا تھا۔ آخر کار وہ گھر ایک لمبے عرصے تک ہمارے پاس رہا۔ اُوم یہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں گیا اور وہ کسی وقت بھی واپس آجائے گا۔ آپ یہاں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ آپ جائیں اور اپنے آفیسر کو بتائیں کہ میں اپنے ملازم کو جوں ہی وہ واپس پہنچے گا آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ یہ گھر بھی میرا نہیں ہے اور یہ لوگ اجنبیوں میں بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔'' سپاہی مخمصے میں تھا کہ وہ میری پیش کش قبول کر کے چلا جائے یا نہیں کہ اتنے میں اُوم کہیں سے گھومتا گھامتا گھر کے اندر داخل ہوا۔ سپاہی نے اُوم اور جودھا کو ساتھ لیا اور ہم سب نے سُکھ کا سانس لیا، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دونوں ملازم بھی واپس آگئے۔ حملہ آوروں نے اُنہیں زیادہ پریشان نہیں کیا۔ انہوں نے ملازموں کو صرف اس قدر متنبہ کیا کہ اگر وہ دوبارہ اس بنگلے کی طرف آئے تو وہ اپنی جان کو خود خطرے میں ڈالیں گے۔ حالانکہ ایک مرحلے پر میں اُن کے بارے نا اُمید ہو گئی تھی۔

پڑوس ہی میں ایک گردوارہ تھا جہاں ہندو مہاجرین کے لیے ایک کیمپ لگایا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے گھر جلا دیئے گئے تھے اور اس بھری دنیا میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں تھی جسے وہ اپنی کہہ سکیں۔ وہ وہاں ریوڑ جیسے ہجوم میں رہتے تھے اور میں کبھی کبھی حیران ہوتی تھی کہ کیا اُن کی حالت ہم سے بہتر نہیں ہے۔ ہم یقیناً قدرے بہتر تھے لیکن جب آپ دکھ درد میں ہوتے ہیں تو آپ کو دوسروں سے علیحدہ کر دینا آپ کے لیے

اچھا نہیں ہوتا۔اس طرح آپ اپنے اردگرد کے انسانوں سے متعلق اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے کنارہ کش ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں۔جہاں دُکھ درد عام سی بات ہو وہاں آپ اپنا خیال زیادہ نہیں رکھتے بلکہ اپنے حالات کو دوسروں کے حالات میں شامل کر لیتے ہیں اور دکھوں کے مقابلہ میں صبر اور خاموشی کی ترغیب کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے اور نہ ہی آپ چکنی مٹی میں رنگ رلیاں منا سکتے ہیں۔

اس کیمپ میں زندگی بہت مشکل تھی اور قریبی قصبوں اور گاؤں کے مسلمان اکثر وہاں آتے جاتے تھے۔ہر روز بلا ناغہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی اپنی پسند کی ہندو لڑکی کو اُٹھا کر لے جاتے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔یہ کسی بھی ہندو لڑکی کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔اس لیے اُن کے ہراساں اور خوفزدہ والدین نے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دور رکھنے کے لیے ایک ترکیب دریافت کی۔انہوں نے یہ کیا کہ کیمپ کے اندر سے لڑکے تلاش کر کے اپنی لڑکیوں کی شادیاں اُن سے کر دیں۔اس طرح موزوں اور مناسب جوڑے تو نہیں بن سکتے تھے لیکن اِس سے دلہنوں کی تلاش میں سرگرداں مسلمانوں کا آنا بند ہو گیا۔اگرچہ شیوادیال نے اپنے آپ کو کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا کہ اُس نے ایک نوجوان بیوہ کو اپنی زوجہ بنانے کا فیصلہ کیا۔اُس کے رویے سے یوں لگتا تھا جیسے اُس نے اجتماعی مقصد کے لیے یہ نقصان اُٹھایا ہو۔اُس نے شادی کے وقت اعلان کیا ''اگر اس بیوہ سے میری شادی اس کو اِن بدمعاشوں سے بچا سکتی ہے تو مجھے کوئی افسوس نہیں۔''

کیمپ میں ایک خاتون ایسی بھی تھی جس کا شوہر گم ہو چکا تھا اور اُس کے ساتھ ایک بچہ تھا۔وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہتی تھی جن کے پاس اُس کو اور اُس کے بچے کو کھلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔وہ چاہتے تھے کہ اُسے ایک مسلمان کے حوالے کر کے اُس سے کچھ غلہ حاصل کر لیا جائے۔لیکن وہ بالکل بضد تھی کہ وہ اُس سے شادی نہیں کرے گی۔وہ امداد کے لیے میرے پاس آئی۔چونکہ وہ ذہنی طور پر بالکل واضح تھی۔میں نے اُس کو نصیحت کی کہ وہ اپنی بات پر ڈٹی رہے اور میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں روزانہ اُسے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دے دیا کروں گی۔ہمارے پاس بھی زیادہ فالتو راشن نہیں ہوتا تھا اگرچہ تھوڑے سے فالتو راشن کی منظوری بھی حاصل تھی۔لیکن وہ اسی پر بہت خوش تھی کہ اُسے کسی کے تعاقب کی اذیت سے نجات ملی ہے۔

صبح کے تقریباً چار بجے تھے جب میں نیند سے جاگ اُٹھی اور مجھے گھر کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔دروازے پر دو تین گھونسوں کی تھپتھپاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔''ہم چار لوگوں نے اکٹھے ہو کر ایک گروپ بنایا اور صبح سویرے کے ملاقاتی کا استقبال کرنے کی تیاری کی جس کے لیے دروازے کے سامنے والے کوریڈور میں دیوار کے ساتھ منسلک مٹی کا دیا جلایا۔جوں ہی دروازہ کھلا سپاہیوں کی ایک قطار اندر داخل ہو گئی۔اُن میں سب

سے آگے بریگیڈ ئیر کے رینک کا ایک آفیسر تھا۔ میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی لیکن دیئے کی ٹمٹماتی ہوئی لو میں اُس کی وردی کا لشکارا بے حد نمایاں تھا۔ پھر میں نے وردیوں کا ایک ہجوم سا دیکھا جن کے اُوپر سر ہی سر تھے جو تاریکی کی وسعتوں میں ہر قسم کی تفصیل اور شناخت سے خالی تھے۔ اس منظر کے فوری تاثرات سحر انگیز تھے۔ کئی ہفتوں سے ہم ایک کنارے پر کھڑے تھے اور زندگی کے آخری دِن گن رہے تھے۔ اس پس منظر میں صبح چار بجے پاکستانیوں کی آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہم سب آخری دعائیں کرنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

میں نے بریگیڈ ئیر سے کہا۔ ''آپ ایک ہی دفعہ ہمیشہ کے لیے ہمارا قصّہ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ ہمارے لیے زیادہ انتظار کوئی خوشگوار صورت حال نہیں ہے۔''

بریگیڈ ئیر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور جواب دیا۔ ''ہم یہاں آپ کو مدد کی پیشکش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے لیے راولپنڈی منتقل ہو جانا بہتر رہے گا۔ ہم آپ کے سفر اور وہاں ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ میں چونکہ آپ کی قیدی ہوں اس لیے مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔'' اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ ہندوستان جانا چاہیں گی؟''

''ابھی نہیں۔ مجھے کچھ وقت کے لیے یہاں ٹھہرنا چاہیے۔''

بریگیڈ ئیر نے کہا۔ ''ہم نے کچھ بسیں کرائے پر حاصل کی ہیں جو آپ سب کو وہاں پہنچا دیں گی۔ لیکن لگتا ہے کہ آپ کسی پر اعتماد نہیں کرتیں۔'' اس کے بعد وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

18

الوداع مظفر آباد!

مظفر آباد کا سارا قصبہ جموں کے چوہدری عبدالحمید☆ کو خوش آمدید کہنے کے لیے سرگرم تھا جو اب پاکستان میں چلے آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ چوہدری صاحب کا خطاب سننے کے لیے آئیں۔ ہم نے بمشکل ابھی دوپہر کا کھانا ختم کیا تھا کہ چوہدری صاحب اور کچھ دیگر آفیسر مجھے ملنے کے لیے آگئے۔ اُن میں ایک وادی لداخ کا کچرو احمد شاہ بھی تھا جو ریاست کی حکومت میں مال آفسر ہوا کرتا تھا۔ جب قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا تو اُس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں مال آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ درّانی بھی اُن کے ساتھ تھا۔ معمول کی علیک سلیک کے بعد چوہدری صاحب نے میرے شوہر کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا۔

میں نے اُن لوگوں کو ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا جو میرے ساتھ تعزیت کرنے آتے تھے۔ اس لیے میں نے اُنہیں چُپ کرا دیا۔ ”آپ کیوں افسوس کر رہے ہیں؟ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے مبارکباد دی جانی چاہیے کیونکہ بہت کم خواتین ایسی خوش نصیب ہوں گی جن کے شوہر میرے شوہر کی طرح ہوئے ہوں گے۔“

اُنہوں نے کہا۔ ”اگر مہتا صاحب نے مجھے جموں جانے کی اجازت دی ہوتی تو میرے بچے بھی آج زندہ ہوتے۔“

”میں اس سب کے لیے جو ہو چکا ہے افسوس کرتی ہوں۔ لیکن کیا آپ میرے شوہر کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ محض حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔“

انہوں نے پیشکش کی کہ وہ میری مدد کریں گے۔ ”میں آپ کو اور آپ کے بچوں کو جموں بارڈر پر لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بدلے میں اپنے کچھ لوگوں کو جو وہاں رُکے ہوئے ہیں واپس لاؤں گا۔“

☆ اصل نام چوہدری حمید اللہ خان

درّانی نے اصرار کیا کہ مجھے اس تجویز سے متفق ہونا چاہیے اور اُسی نے میرے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن مسز مودی، اُس کی بیٹی کملا اور اپنے ملازموں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ چوہدری صاحب نے کہا۔ "میرے لیے اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو لے جانا ممکن نہیں۔"

"پھر مجھے خدشہ ہے کہ ہم سب کو یہیں رہنا پڑے گا۔ میں اِن کو اس بیچارگی کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔"

انہوں نے اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی اور اس قدر تھک گئے کہ مزید دلیل بازی نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اتفاق کرلیا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان باندھ لیا اور لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد درّانی ہمیں لینے کے لیے آ گیا۔ ہم کُل ملا کر گیارہ نفوس بنتے تھے۔ میرے پانچ بچے، سویدش، کملا، مسز مودی، دو ملازمین، اور میں خود۔ جب چمن کے گھر سے ہمیں الوداع کہا جانے لگا تو سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسوں تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ سب ہمیں بُہت یاد کریں گے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اور اب اُنہیں اس طوفان کا تنہا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ہم نیچے سڑک پر اُترے جہاں بس ہمارا انتظار کررہی تھی۔ مولوی کو بھی خبر ہوگئی تھی کہ ہم جارہے ہیں اس لیے وہ بھی ہمیں الوداع کرنے کے لیے آ گیا تھا۔

جلد ہی ہم مظفرآباد سے نکل گئے۔ ہم نے بس کے ڈرائیور کو پہچان لیا۔ میں نے کئی مرتبہ اِسی بس میں سری نگر سے مظفرآباد کا سفر کیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے پوچھا کہ کیا اُسے یاد ہے کہ آج سے دو ماہ پہلے وہ مجھے سری نگر سے مظفرآباد لایا تھا؟ لیکن اُس کا روّیہ انتہائی غیر دوستانہ تھا اور وہ گفتگو شروع کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیا آپ ہندوستان جارہی ہیں؟ ہندوستانی فوج چیچک کے مرض میں مبتلا ہے اور تم جلد دیکھ لوگی کہ اُن کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے۔"

ہر پُل پر بس کو روکا جاتا اور سنتری معمول کی پوچھ گچھ کرتا۔ بس کہاں جارہی ہے اور مسافر کون ہیں وغیرہ۔ جب اُنہیں یقین ہوجاتا تھا کہ بس پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے آرہی ہے تو تب ہی وہ اُسے آگے جانے دیتے تھے۔ ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں کچھ کشمیری مسلمان بھی تھے جو ہمارے بچوں کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ جب ہم پاکستان کے علاقے گڑھی حبیب اللہ پہنچے تو ایک بڑا مجمع چوہدری صاحب کو سننے کے لیے وہاں موجود تھا۔

ہم نے بس میں ہی بیٹھ کر اُن کے آنے کا انتظار کیا اور درّانی نے مجھے کہا۔ "اگر کوئی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ آپ کون ہیں اور کہاں جارہی ہیں تو مہربانی کرکے کچھ بھی نہ بتائیں۔ اُسے میرے ساتھ بات

کرنے دیں۔ لیکن اگر آپ کچھ کہنا ضروری سمجھیں تو اُسے بتائیں کہ آپ میری بہن ہیں اور میرے گھر جا رہی ہیں۔"

گڑھی حبیب اللہ سے لے کر ایبٹ آباد تک راستے میں ہمیں بے شمار قبائلی ملے جو گزرتی ہوئی بس میں ہمیں دیکھ کر گھورتے تھے۔ ایبٹ آباد کے ڈاک بنگلے میں ہمیں کمرہ نہیں مل سکا کیوں کہ وہ سارا علاقہ قبائلیوں سے اَٹا پڑا تھا۔ بالآخر ہمیں شہر کے ایک ہوٹل پر لے جایا گیا۔ ہمارے لئے ایک کمرہ بُک ہوا اور درّانی نے کھانے کا آرڈر دیا۔ ہم سب اُس رات بڑے مزے سے سوئے اور دوسرا دن بھی ہوٹل ہی میں گزارا۔ دِن کے وقت چوہدری صاحب بہت مصروف رہے اور شام کو جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہمیں راولپنڈی روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جانے کو کہا۔

راستے میں درّانی نے ڈرائیور کو کہا کہ وہ ایک گھر کے سامنے رُکے۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ اُس کے رشتہ دار یہاں رہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنا کچھ سامان اُن کے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہمیں کہا۔ "کیا آپ نیچے اُتر کر میرے رشتہ داروں سے ملنا پسند کریں گے؟" اُن میں سے ایک ریاست جموں کشمیر میں کرنل رہ چکا تھا اور اُسے بچ کر یہاں آنے سے پہلے جموں میں بہت بُرے دن دیکھنے پڑے تھے۔

ہم سب گھر کے اندر چلے گئے۔ ایک بوڑھا آدمی چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا اور اُس کے قریب ہی دو بوڑھی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ایک وردی پوش نوجوان اُوپر نیچے چکر لگا رہا تھا۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے اور درّانی نے ہمارا تعارف کروایا۔ بوڑھی خواتین جاننا چاہتی تھیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم نے اُنہیں بتایا کہ ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔ دونوں خواتین ایک دوسری کی طرف دیکھتے ہوئے لمبی چوڑی واقفیّت کا احساس دلا رہی تھیں۔ بوڑھے کرنل نے کہا۔ "قبائلی لڑکوں کو نہیں چھوڑیں گے۔" وہ اُن خواتین کے اندرونی خوف کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اُس نے مزید کہا۔ "پانچ ہزار مسلمان جموں میں داخل ہو چکے ہیں اور یقینی طور پر وہ جموں کو ہندوؤں سے چھین لیں گے اور ہندو بھی اُسی طرح نقصان اُٹھائیں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا ایک بیٹا اب بھی گم ہے؟" بیٹے کی یاد نے اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر دیئے۔

خواتین صرف ہنس دیں۔ مصائب اور دکھوں نے انہیں اتنا سنگ دل بنا دیا تھا کہ اب وہ اُن کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ تاہم اُن کے ہنسنے کا انداز کسی حد تک پُر اسرار اور مصنوعی تھا۔ بچے سہمے ہوئے تھے اور ہم گھر سے نکل آئے۔ بوڑھی خواتین نے قبائلیوں کے ہاتھوں بچوں کو قتل کرنے کے بارے جو کچھ کہا تھا راولپنڈی پہنچنے تک

مسلسل میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ہم ایک کیمپ میں رُکے جو کشمیری مسلمانوں کے لیے لگایا گیا تھا۔وہ ہندوستان سے وہاں آئے تھے۔ہمیں اُس کیمپ میں ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے کہا گیا کہ اُس کے بعد ہمیں مسلمانوں کے ساتھ تبادلہ کے لیے جموں کی سرحد پر لے جایا جائے گا۔ہم اُس کیمپ میں داخل ہوئے جو ڈی ۔اے۔وی کالج میں قائم کیا گیا تھا جہاں ہمیں ایک کمرہ دیا گیا۔

درّانی اور چوہدری صاحب یہ وعدہ کر کے کہ وہ اگلے روز واپس آئیں گے، وہاں سے چلے گئے۔ہم ماحول کی اجنبیت کے باعث قدرے خوفزدہ تھے۔ کیمپ کے کشمیری ہمیں بے تکلّف کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہمارے بچوں کے ساتھ مخلصانہ شفقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ایک آدمی ہمارے کمرے میں آیا اور کہا۔''میں ہندو ہوں اور مسٹر مہتا میرے دوست تھے۔میرا ایک مسلمان دوست اور میں اس کیمپ کے انچارج ہیں۔ہم آپ کا راشن آپ کو بھیج دیں گے۔اُس نے کچھ کھانا بچوں کے لیے اور پھل سبزمودی اور میرے لیے بھیجے۔اس سب کے باوجود کہ جو کچھ اُس نے کہا میں اس بات پر قائل نہیں تھی کہ اُس نے سچ بولا ہے۔میں اس آدمی کو یاد کرنے کے لیے اپنی یاداشت پر زور دیتے دیتے سوگئی۔ مجھے احساس تھا کہ میں اس آدمی کو اس سے پہلے کبھی نہیں ملی۔

19

کشمیری مسلمان

جب میں بیدار ہوئی تو سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک سنتری تھا جو کندھے پر رائفل رکھ کر ہمارے کمرے کی طرف آنے والے راستے میں اُوپر نیچے چکر لگا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا لیکن میں صرف اُس کا تاریک سا ہیولا ہی دیکھ سکی جو مٹیالے آسمان کی مخالف سمت میں کھڑا تھا۔ اُس کے بھاری کیلوں والے جوتے پتھر کے فرش سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جس میں یکسانیت کی باقاعدگی تھی اور جو وقفوں وقفوں سے مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیتے تھے۔ میں دوبارہ جاگی اور دیکھا کہ وہ وقتی طور پر نظر سے اُوجھل ہے لیکن پھر اچانک ایڑیوں کے بل چل کر اُس کے واپس آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ معمول کے وقفوں سے لیکن بالکل بے مقصد ارادے سے چلتا جاتا تھا۔ ابھی تک سورج مشرق کی جانب بہت نیچے تھا لیکن اُس کی شعاعیں صبح کے تازہ آسمان پر سُرخ ٹکڑوں کی شکل میں سہرے کی طرح نہ جانے کس کے ساتھ لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کئی ہفتوں میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں صبح سویرے اتنی دیر تک بستر پر پہلو بدلتی رہی اور نیند کے بعد کی تازگی سے محظوظ ہوتی رہی۔ میں اب پہلے کی طرح کسی خطرناک کنارے پر نہیں تھی اور مستقبل جو بالکل ساکت اور جامد ہو چکا تھا اور حال کا حصہ بن کر اب دوبارہ کسی حد تک متحرک ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال کسی سست رو اور جگالی پسند جانور، جو معمولی سی تبدیلی اور حرکت کے آثار کے نتیجہ ہی میں گہری نیند سے اُٹھنے کی تیاری کرنے لگتا ہے، سے ملتی جلتی تھی۔ ماضی میری یادداشت سے بیدخل ہو رہا تھا۔ میں عجیب سی سرخوشی کا احساس لیے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور حیران تھی کہ کیا یہ واقعی اس وجہ سے ہے کہ میں آنے والے دِن کا خوشی سے انتظار کر رہی ہوں۔

ہمیں خاصی مقدار میں دودھ، گھی اور باقی راشن بھیجا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ کئی کشمیری مسلمان اِسی کیمپ میں ہیں اور اُن میں سے کئی تو ہمیں ملنے کے لیے بھی آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہم بھی جہنم سے گزر کر آئے ہیں اور آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوش ہیں۔ ہمارا دل اپنے ملک کے لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔'' لیکن اُنہوں نے اپنی مشکلات کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے والے

ایک دوسرے کے ساتھ اپنے مسائل کا ذکر کم ہی کرتے ہیں۔شاید یہ مصائب کا بپتسمہ (Baptism) تھا جس نے اُنہیں تصوّف کی طرف مائل کر دیا تھا جس میں خاموشی ہی کے ذریعے حصہ لیا جاتا ہے۔یہ اتنا نازک اور متبرک معاملہ تھا کہ اسے کسی جاہلانہ گفتگو کے ذریعے ایک دوسرے پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کیمپ میں دو مسلمان لڑکے ایسے بھی تھے جو میری پیدائش کی جگہ سے تعلق رکھتے تھے۔بلکہ وہ میرے باپ کے گھر سے بالکل قریب ہی رہتے تھے۔میں نے فوراً اُنہیں پہچان لیا اور اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔میں نے اُن سے پوچھا۔''آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟'' وہ جموں کے کسی کالج میں تھے اور اُنہیں فرقہ وارانہ فسادات کے خوف سے وہ جگہ چھوڑنی پڑی تھی۔

''لیکن ہمارے آبائی ضلع میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔اور مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اُن میں سے ایک نے کہا۔''ہم بھی یہی اُمید رکھتے ہیں۔کشتواڑ میں ہمیں کبھی فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اب بھی وہاں کے لوگ فسادات شروع نہیں کریں گے۔''

سیاست جب اس قسم کے سادہ لوح لوگوں کے روّیوں کو عمومیّت کی طرف لے جاتی ہے تو وہ بالکل مصنوعی اور غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے۔اُن کا آبائی علاقہ، اُس کا ماحول اور اس کے لوگ اُن چند روایات کا حصہ تھے جن کو یہ لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کی اہمیت سمجھتے تھے اور اولین ترجیح کے طور پر وہ انہی چیزوں سے محبت کرتے تھے اور اِن کا احترام کرتے تھے۔حقیقت میں یہی وہ واحد سماجی تصوّر تھا جو اُن کے ذہن میں احساسات کی قربت پیدا کرتا تھا۔ہر شخص اکثر سنتا تھا اور پڑھتا تھا کہ فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔اور لوگ بلاناغہ اِن موضوعات پر گفتگو کرتے تھے جیسے کہ یہ دونوں سماجی اور انفرادی خصوصیات ہوں۔لیکن یہ ہندو اور مسلم جنہیں سیاستدانوں نے قیاس آرائیوں کی طرف مائل کیا اور سمجھایا، چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے، جہاں یہ مقامی اور ہم وطن لوگ نسل در نسل اجتماعی ذہنیت اور دوستیوں کو مشترکہ مفادات کے ذریعے برقرار رکھے ہوئے، اپنی اپنی کمیونٹی کو سماجی اور جذباتی لحاظ سے خود کفیل بنائے رکھتے ہیں۔اُنہیں شاید کبھی ایسا کوئی حکم یا فرمان کہیں سے نہیں ملا جس کی وجہ سے وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ محبت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔یہ جذبہ اُنہیں فطرت نے عطا کیا ہے۔معمول کے اداروں کے علاوہ مذہب اُن کے لیے محض تجریدی (Abstraction) حیثیت رکھتا ہے۔کوئی بھی چیز جو شعوری سطح پر نہیں دیکھی جاسکتی حقیقی نہیں ہوسکتی۔یہ کچھ اس طرح تھا کہ اُنہیں کسی نظریے کو قبول کرنے سے پہلے اُسے جسمانی طور پر محسوس کرنا تھا۔لیکن

سیاست دانوں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور اُنہوں نے سچائی کو نئے انداز میں پیش کرنے کے دوران اُسے مسخ کر دیا۔ اُس نے (مسلمان لیڈر) متنبّہ کیا۔ ''اسلام خطرے میں ہے۔ آپ کی مسجد، آپ کی نماز، بلکہ آپ کے بچے اور آپ کی جائیدادیں بھی تباہی و بربادی سے دوچار ہونے والی ہیں۔'' اُس کی منطق واضح اور قابلِ فہم نہیں تھی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کس طرح یہ باتیں ایک دوسرے تک پہنچیں اور بالآخر وہ اُسی راستے پر چل پڑا۔ سماجی اُلٹ پلٹ جو وہ چاہتا تھا اُس نے حاصل کر لیا۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس کی بھاری قیمت ادا کی بہت کم محسوس کر سکے (اُنہیں محض شک کا معمولی سا شائبہ محسوس ہوا) کہ اسلام کو کبھی کوئی خطرہ نہیں تھا بلکہ یہ خطرہ تخلیق کیا گیا تھا۔

میں نے لڑکوں سے پوچھا۔ ''تم یہاں کہاں رہتے ہو اور کس کے ساتھ رہتے ہو؟''

''ہم اسی کیمپ میں رہتے ہیں۔ یہ مسلمان مہاجرین کو فائدہ پہنچانے کے لیے کھولا گیا ہے۔ اب اس میں تقریباً تین سو کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔ جموں سے صرف ہم ہی آئے ہیں۔ یہ کیمپ مسٹر ریڈی اور اُس کے ایک مسلمان دوست چلا رہے ہیں۔ ہر صبح ہم ڈرل کرتے ہیں اور پھر ہمیں رائفل چلانا سکھایا جاتا ہے۔ پاکستانی فوج کے کچھ کشمیری مسلمان اس ٹریننگ کے انچارج ہیں۔

میں نے کہا۔ ''میں اس کیمپ سے متعلق بہت خوش ہوں۔ یہ مجھے بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یاد دلا رہا ہے۔ یہاں لوگ اپنے اپنے مذہب کے بارے زیادہ حسّاس نہیں ہیں۔''

''ہم یہ سارا کریڈٹ مسٹر ریڈی کو دیتے ہیں۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔''

''مسٹر ریڈی کون ہے؟ مجھے اُس کے بارے مزید کچھ بتاؤ۔'' میں نے اُن سے پوچھا۔

''وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ کشمیر کی حکومت نے اُس کے اخبار پر پابندی لگادی تھی اور ریاست سے نکال دیا تھا۔ دونوں ہندو اور مسلمان اُس کی حقیقی معنوں میں عزت کرتے ہیں۔'' مجھے اچانک وہ شخص یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ اُسے راولپنڈی جاتے ہوئے مظفر آباد میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کرنل اُس کے خلاف سخت کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے شوہر نے اُس کا ہاتھ روک لیا تھا۔

اُس کے بعد مسٹر ریڈی بھی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ ویمل اور سریش اُس کے ساتھ ذرا باہر (Outing) نکل گئے۔ وہ بالکل پاگل ہوئے جا رہے تھے جب یہ اعلان کرنے کے لیے دوڑے کہ مسٹر ریڈی پہنچ رہا ہے۔ مسٹر ریڈی نے اُن دونوں کو جوتے خرید کر دیئے اور سریش کو ایک جرسی (Pullover) بھی۔ اس تمام عرصے میں اُس نے صرف ایک قمیض پہن کر گزارا کیا تھا۔ مسٹر ریڈی لڑکوں کو چائے پلانے کے لیے بھی لے

گیا اور اُنہیں اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ لڑکے ذرا گھبرائے ہوئے تھے کیوں کہ اُنہیں خدشہ تھا کہ شاید اجنبیوں سے تحفے لینے کے معاملے میں میری منظوری حاصل نہ ہو۔ میں نے مسٹر ریڈی کا شکریہ ادا کیا اور اُسے بتایا۔ "آپ کو یہ چیزیں ہمارے لیے نہیں خریدنا چاہییں تھیں۔ میرے لیے یہ سب کچھ قبول کرنا مشکل ہے۔"

"براہ مہربانی تکلف نہ کریں۔" اُس نے جواب دیا۔ "آخر کار مسٹر مہتا میرا بہت اچھا دوست تھا۔ علاوہ ازیں ان لڑکوں کے پاؤں کی بُری حالت تھی۔ مجھے آپ کے تکلیف دہ تجربات کا علم ہو چکا ہے۔ یہ سُن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ کیا میں آپ کو اپنے گھر میں منتقل ہونے کا مشورہ دے سکتا ہوں؟ ابھی ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے لیے آپ کو جموں بھیجنا کب ممکن ہوگا۔ اس دوران میں آپ کو یہاں رہنے کی نصیحت نہیں کر سکتا۔" مسٹر ریڈی کچھ وقت کے لیے ہمارے پاس رہا۔ میں نے مسز مودی سے مشورہ کیا۔ پہلے تو مسز مودی نے ایک اجنبی کے ساتھ رہنے کے خیال کو پسند نہیں کیا لیکن بعد میں، میں نے اُسے قائل کر لیا۔

مجھے اُس بات کا کوئی زیادہ افسوس نہیں تھا کہ ہمیں فوری طور پر جموں کیوں نہیں لے جایا جا رہا۔ میں یہاں اِن کشمیریوں کے پاس بہت خوش تھی اور یہاں جو بھی مسلمان تھے وہ دوسروں کے مقابلے میں خوش گوار تضاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے حملہ آوروں کے بارے بے شمار خبریں سنیں کہ وہ ریاست میں کیسے داخل ہو گئے اور ہندوستانی فوج نے عین وقت پر اُن سے سری نگر کیسے چھین لیا۔ اُن میں سے اکثر نے زیادہ حملہ آور نہیں دیکھے تھے۔ اُن کے پاس زنا بالجبر اور گھیراؤ جلاؤ کی خبریں زیادہ تو سُنی سُنائی تھیں۔ کچھ مسلمانوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مظفر آباد میں اُن کے رشتہ داروں کے بارے کچھ جانتی ہوں؟ میں نے اُن سے کہا۔ "آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو بھی معاف نہیں کر رہے۔ بلکہ اُن میں سے اکثر کو قوم پرست تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے۔"

پہلی مرتبہ اِن لوگوں کو محسوس ہوا کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے شیخ عبداللہ کے بارے بھی پوچھا۔ میں نے کہا۔ "آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ مل کر حملہ آوروں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک منصف مزاج ذہن کا مالک ہے جو فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہے۔"

میں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ میں نے اس مفروضے کو بنیاد بنایا تھا کہ اُن میں سے اکثر نے حملہ آوروں کی حکومت سے دھوکہ کھایا تھا۔ وہ میرے کانوں میں اعتماد کی بنیاد پر کچھ کہنے سے پہلے خفیہ طور پر اِدھر اُدھر دیکھ لیتے تھے۔ "ہمیں بھی کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑنی چاہیے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ کتنی مشکل ہے اور کیسے ہوگا۔"

مسٹر ریڈی ہمیں پونچھ ہاؤس منتقل کرنے کے لیے بس لے کر آ گیا۔ اس پر ''آزاد کشمیر'' کے الفاظ نمایاں طور پر درج تھے اور اس کے اندر ایک وردی پوش امریکی سپاہی بیٹھا ہوا تھا جس کے سر پر خاکی پگڑی تھی جو بھدّی لگ رہی تھی۔ پونچھ ہاؤس بہت وسیع تھا اور اس میں ہنگامی انتظامیہ کام کر رہی تھی۔ وہاں کئی لاریاں اور موٹر سائیکل تیاری حالت میں رکھے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ ایک ہی کمرے میں ٹھونسے ہوئے تھے اور کئی بڑے لیمپوں کی روشنی میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ ایک امریکن بریگیڈیئر اور ایک معزز مسلمان اسی گھر میں مسٹر ریڈی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہاں زندگی کافی آرام دہ تھی اور ہم نے بہت اچھی طرح گرم پانی سے غسل کیا۔ ان تین ماہ میں مجھے اچھے صابن کی خوشبو بھول چکی تھی۔ یہ بڑا صحت مند تجربہ تھا۔ ہمارے کھانے کے لیے بھی تین ڈشیں تھیں۔ ہم آگ کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنے صاف سُتھرے ہاتھوں کو گرم کیا۔ کافی عرصہ سے مجھے اس طرح کی خالص اور سادہ خوشیاں نصیب نہیں ہو سکی تھیں۔ ہم اپنی کرسیوں ہی پر سو گئے۔ دوسری صبح کئی کشمیری مسلمان جو وہاں کام کرتے تھے (میرے شوہر کو جانتے تھے) ہمیں ملنے کے لیے آئے اور اُن میں سے کچھ بچوں کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لے کر آئے۔ درّانی اور امریکن بریگیڈیئر بھی آئے۔ اُنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اب ایک یا دو دن میں اُن کے لیے جموں کی روانگی ممکن ہو سکے گی۔

شام تک مجھے ایک اور اہم ملاقاتی سے واسطہ پڑا۔ یہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کا وزیر دفاع علی احمد شاہ تھا۔ وہ میرے شوہر کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس وقت پرانی یادوں کو کریدنے کے موڈ میں تھا۔ اُس نے اُن دنوں کا ذکر کیا جب وہ دونوں اکھٹے تھے اور کشمیر پر آنے والے بُرے دِنوں پر افسوس کا اظہار کیا۔ ''ہم نے یقیناً اچھے دن دیکھے ہوئے ہیں۔'' اُس نے کہا۔ بظاہر وہ اپنے قول میں مخلص تھا کیوں کہ وہ تقریباً بھول چکا تھا کہ اِن بُرے دنوں کی ذمہ داری اُس پر بھی اتنی ہی عائد ہوتی تھی جتنی کسی اور پر۔ بلاواسطہ (Indirectly) ہی سہی۔

مسٹر ریڈی بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اُن دونوں کو بتایا کہ مجھے اُن سے مدد چاہیے۔ مظفر آباد میں میرے کچھ دوست ہیں جن کے ساتھ میں وعدہ کر کے آئی ہوں کہ جوں ہی میں کسی ٹھکانے پر پہنچوں گی تو انہیں یہاں سے نکلوانے کے لیے پوری کوشش کروں گی۔ مسٹر ریڈی فوراً رضامند ہو گیا اور اُس نے اُن لوگوں کے نام اور پتے لکھ لیے۔ اُس نے کہا۔ وہ اُنہیں بھی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرے گا۔ لیکن مسٹر ریڈی نے مجھے یاد دلایا کہ میں بحفاظت ہندوستان پہنچ جانے کے بعد یہ لڑائی ختم نہیں کروں گی۔ میں اُن لوگوں سے جنہیں پیچھے چھوڑ کر جا رہی تھی، زیادہ خوش نصیب ہوں اس لیے اُن کا مجھ پر قرض ہے کہ میں اُن کے لیے کام کروں۔ میر پور میں قائم علی بیگ کیمپ کسمپرسی کی حالت میں تھا اور اُسے کافی مالی مدد کی ضرورت تھی تا کہ

اُسے چلایا جا سکے تو کیا میں کوشش کروں اور ہندوستان سے فنڈز جمع کر کے مسٹر ریڈی کو بھیجوں؟ میں نے وعدہ کیا کہ مجھے آسانی سے باہر نکلنے کا راستہ مل رہا ہے اس لیے میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کروں گی۔

ہر شخص نے اس معاملے کو طے شدہ سمجھ لیا تھا، جس میں میں بھی شامل تھی کہ ہم چند دنوں میں ہندوستان پہنچ رہے ہیں۔ امریکن بریگیڈیئر کوئی یادگار مانگ رہا تھا کیوں کہ اُس کے پاس کیمرہ تھا جس سے اُس نے ہمارے گروپ کی ایک تصویر لی۔ اُس کے بیرے نے میرے بچوں کا اس قدر محبت وشفقت سے خیال رکھا کہ اُن کا تھوڑا سا وزن بھی بڑھ گیا اور اُن کے زرد گالوں پر سُرخی آ گئی۔

20

دوبارہ جیل میں

پونچھ ہاؤس میں ہمیں بالکل کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں اس بارے فکرمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ جموں بارڈر اور اُس سے آگے ہمیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ درّانی چھ دِنوں کے بعد ہمیں ملنے کے لیے آیا اور مجھے یقین دلایا کہ اگلی صبح اسے جموں کے لیے روانہ ہونے کا پورا یقین ہے۔ مسٹر ریڈی اور بریگیڈیئر بہت مصروف تھے اور ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے تھے لیکن اُن کے اور درّانی کے علاوہ آٹھ اور کشمیری ہمارے گروپ میں سفر کرنے والے تھے۔

جہلم کے پُل تک کا سفر لمبا اور غیر دلچسپ قسم کا تھا۔ جوں ہی ہماری بس متروک سڑک پر اُتری تو میں نے باہر کی دُنیا کی طرف خالی خولی نظروں سے دیکھا جسے ہم کسی افسوس کے بغیر تیزی سے پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ سخت سردی کے باوجود ہمارے سامنے سبزہ پھیلا ہوا تھا لیکن میرے لیے کسی کشش کا باعث نہیں تھا۔ میرا ذہن جو جسمانی اذیتوں کا مارا ہوا تھا، بیمار تھا اور مزید بیمار ہونا چاہتا تھا۔

جوں ہی ہم راولپنڈی کے باہر والے مضافات میں پہنچے تو بس کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ بلکہ بس کے رُکنے سے پہلے ہی ہمیں قبائلیوں کے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ وہ کے اردگرد جمع ہوگئے جو انہیں واپس پیچھے کی طرف دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُن میں سے کچھ تو دوڑ کر بس کی چھت پر سوار ہوگئے اور زوردار مطالبہ کرنے لگے کہ انہیں اگلے مورچوں پر پہنچایا جائے۔ وہ وہاں جم کر بیٹھ گئے، ایسے مسافروں کی طرح جن کی آنکھوں میں سچائی کی چمک اور بس سٹاپ پر طویل انتظار کا غصّہ ہو۔

درّانی نے وضاحت کرنے کی بہت کوشش کی کہ بس پہلے ہی بھری ہوئی ہے اور یہ کہ وہ کسی بھی صورت اگلے مورچوں پر نہیں جا سکتا۔ اُن میں سے ایک نے رائفل نکال لی اور کہا۔ ''اگر آپ ہمیں پیچھے چھوڑ کر جائیں گے تو آپ اِن مسافروں کی جگہ لاشیں لے کر جائیں گے۔'' اور اس بھونڈے مذاق پر وہ خود ہی خوش ہونے لگا۔ ہجوم بڑھتا گیا اور دوسروں کی طرح وہ بھی بحث و دلیل کے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ قریب کھڑے

تماشائی لاتعلق ہو کر ایک مخصوص حظ محسوس کرتے رہے حالانکہ اُن کا روّیہ متشدّدانہ حد تک جانبداری کا تھا۔لیکن ہجوم کا حصہ ہونے کی وجہ سے اُن کی دلچسپی حیرت انگیز حد تک غیر جانبدارانہ تھی۔اُن کے نزدیک فاتح کی نیکی (خوبی) اخلاقی لحاظ سے بالکل بے معنی تھی۔

جوں ہی ایک پولیس آفیسر وہاں پہنچا تو اچانک خاموشی چھا گئی۔اُس نے درّانی کو بلایا۔''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' درّانی کو یقین تھا کہ نمایاں الفاظ میں تحریر''آزاد کشمیر'' کا بورڈ کام کر جائے گا۔''میرا خیال تھا کہ یہ واقعی پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی بس ہے۔''اُس نے جواب دیا۔''ہم اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو جموں بارڈر پر لے جارہے ہیں۔''

''مجھے خدشہ ہے کہ آپ کمشنر کی تحریری اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔''

درّانی کا خیال تھا کہ وہ پولیس آفیسر خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کر معاملہ خراب کر رہا ہے اور کہا''ہم یہاں نہیں رُکنا چاہتے۔ہمیں کسی کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ہم کئی ماہ سے''پاکستانی مقبوضہ کشمیر'' کی حکومت کے لیے کام کر رہے ہیں۔''

لیکن آفیسر نے اصرار کیا کہ حال ہی میں تازہ احکامات جاری ہوئے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو دفتر میں جا کر تصدیق حاصل کر سکتے ہیں۔ہم سب مل کر دفتر کی طرف گئے اور ہمارے ایک آدمی نے نیچے اُتر کر نئے احکامات کے بارے دریافت کیا۔میں نے اُسے تاریک اور مایوس کن تیوری کے ساتھ واپس آتے ہوئے دیکھا۔لہٰذا میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ جموں اگر ہے بھی تو ہمارے لیے ابھی نہیں ہے۔

وہ بس میں سوار ہوا اور کہا۔''یہ بڑے مشکل لوگ ہیں اور بہت شکی ہیں۔وقتی طور پر ہمیں واپس راولپنڈی جانا ہوگا۔اگر ہمیں کمشنر سے اجازت نامہ مل بھی جائے تو ہمیں کل تک بارڈر پر پہنچنے کے لیے مقدّر کی یاوری چاہیے۔''میں جانتی تھی کہ یہ پہلے سے بھی بُرا ہوا۔حوصلہ مندآواز میرے حق میں تھی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ باقی سارے لوگ مایوس ہوں۔درّانی ہمارے ساتھ واپس نہیں آیا لیکن اُس نے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے دِن آجائے گا۔

ہم بس لے کر سیدھے کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ہم میں سے ایک آدمی کمشنر کے کمرے میں گیا اور جب واپس آیا تو وہ اپنی مقامی زبان میں روانی سے قسمیں کھا رہا تھا۔''یہ لوگ ہمیں چوروں کا گروہ سمجھ کر سلوک کرتے ہیں۔ہم نے اِن کے لیے اتنا کچھ کیا ہے لیکن پھر بھی وہ ہم پر اعتماد نہیں کر رہے۔''وہ نزدیک ترین کسی ٹیلیفون پر گیا اور وہاں سے مسٹر ریڈی کو ٹیلیفون کیا جو جلد ہی موٹر سائیکل پر وہاں پہنچ گیا۔دونوں آدمی کافی دیر تک محوِ گفتگو رہے اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ ہم پونچھ ہاؤس واپس چلے جائیں۔

جب ہم کیمپ واپس آئے تو کئی اور سنتری ہمارے کمروں کی حفاظت پر تعینات کر دیئے گئے اور بریگیڈ ئیر رات بھر چکر لگا تا رہا۔ خاموشی اور سکون جس کی وجہ سے میں اس جگہ کو پسند کرتی تھی رخصت ہو چکے تھے۔ ہمارے اندر بھی کھچاؤ اور تناؤ زوروں پر تھا اور اب ہمارے اردگرد بھی۔ سنتری غیر معمولی طور پر محتاط تھے اور بار بار اُن میں سے کوئی ایک بالکل ساکت وجامد ہو کر وہ آوازیں سننے کی کوشش کرتا جو سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مسٹر ریڈی نے صبح صبح مجھے بتایا کہ کسی نے اُنہیں مطلع کیا ہے کہ قبائلی کسی بھی وقت یہاں چھاپہ مار سکتے ہیں۔ بہرحال ایسا ہوا نہیں۔

مسٹر ریڈی نے مجھے یقین دلایا کہ مطلوبہ اجازت نامہ ایک یا دو دن میں مل جائے گا۔ تین دن گزر گئے مگر ہم ابھی تک منتظر تھے۔ مسٹر ریڈی بھی نا اُمید ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ جموں کیسے جائیں گے۔ مسٹر قیوم جو پشاور کا پرائم منسٹر (وزیر اعلیٰ) ہے آج یہاں آ رہا ہے اور میں اس معاملے میں اُس سے بات کروں گا۔'' ممکن ہے کہ آپ پشاور سے ہو کر انڈیا جا سکیں۔ مجھے اُمید ہے وہ ہماری مدد کر سکے گا۔''

شام کے وقت جب مسٹر ریڈی مسٹر قیوم سے ملنے جا رہا تھا تو اُس نے ویمل سے کہا کہ اگر وہ چلنا چاہے تو۔ ''تم کہتے ہو تم حملہ آوروں سے نہیں ڈرتے۔ آؤ! ہم تمہیں ایک حملہ آور دکھاتے ہیں۔'' ویمل اس پیشکش جس کے ذریعے اُسے ناچ کود کا موقعہ مل رہا تھا، پر بہت خوش تھا۔ تاہم مسٹر قیوم نے اِس معاملہ میں مدد کرنے سے معذرت کر لی۔

اسی اثنا میں خبریں موصول ہوئیں کہ پاکستان نے ہمیں جیل بھیجنے کا حکم دے دیا ہے۔

پونچھ ہاؤس میں مختصر قیام کے دوران میں بالکل بے پرواہ ہو گئی تھی اور یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے لیکن یہ حقیقی نہیں ہے، ایسی بارش کی خوشبو کی طرح جو کہیں دور برس رہی ہو، مصیبت کسی بھی وقت دوبارہ ہمیں دبوچ سکتی ہے۔ یہ معاملہ کچھ اس طرح تھا جیسے آپ کسی گرم اور آرام دہ ڈریسنگ روم میں جلاّد کے ساتھ جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ تاہم جب یہ مصیبت فی الواقعی رونما ہوئی تو میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ مسز مودی نے میری جانب الزام عائد کرنے والی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ ہمارا یہی حشر ہو گا۔'' اُن سب نے محسوس کیا کہ میں لوگوں پر خواہ مخواہ اعتماد کرنے کی عادی ہوں۔ چوہدری صاحب اور درّانی بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شروع شروع میں میں نے ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو گئی ہوتی تو یہ میری عزت افزائی کا ذریعہ ہو سکتی تھی لیکن جب یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو اُن سب نے اِسے ناقص قرار دیا۔

مسٹر ریڈی اس سارے معاملے کو ذاتی شکست سمجھ رہا تھا بلکہ کسی نہ کسی سطح پر وہ اپنے آپ کو بھی اس ناکامی کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ جیل کی گاڑی ہمیں لینے آ گئی۔ اس میں چھ سنتری اور دو پولیس آفیسر تھے۔ وہ بہت غیر جذباتی اور لاپرواہ دکھائی دیتے تھے جیسے وہ پرانا فرنیچر جمع کرنے آئے ہوں۔ مسٹر ریڈی ہمارے لیے راشن سے بھرا ہوا ایک بیگ لایا اور دس دس روپے کے باریک بنی سے تہہ کیے گئے تین نوٹ میری مٹھی میں تھما دیئے۔ میں اُس کی اس مہربانی پر پریشان تھی لیکن میں جانتی تھی کہ اگر میں نے یہ روپے قبول کر لیے تو مسٹر ریڈی ہمارے جیل بھیجے جانے پر اپنے آپ کو کم ذمہ دار سمجھنے لگے گا۔ بہر حال میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے یہ رقم جلد از جلد واپس کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اُس کے ملازموں نے بھی ہماری بہت مدد کی اور میں حیران تھی کہ میں اس موقعہ پر معمول کے الوداعی جذبات کو مزید بھڑکائے بغیر اُن سے کیا کہوں اور کیسے شکریہ ادا کروں۔

اُن میں سے ایک نے جو مسلمان تھا ہجوم سے راستہ بناتے ہوئے پولیس آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بمہربانی ماتا جی کا اچھی طرح خیال رکھیں اور دیکھیں کہ اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ ہو۔'' اُس کی شائستگی سے بھی سادگی اور اُجڈپن جھلکتا تھا۔''

آفیسر اس کے اس دلیرانہ انداز پر محظوظ ہوا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ہم اِن سے کیا سلوک کریں؟'' اُس نے پوچھا۔

''اوہ! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ ہمارے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔''

مسٹر ریڈی اس بات پر خوش نظر آ رہا تھا کہ اُس کی محنت ضائع نہیں گئی۔

مجھے اب بھی معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کس وجہ سے ہمارے خلاف تھا۔ ہمیں یہ بتائے بغیر جیل بھیجا جا رہا تھا کہ ہمارا قصور کیا ہے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے حکام کو مطلع کیا تھا کہ میں نے کئی کشمیریوں کو نئی حکومت کی مخالفت کرنے کے لیے تیار کیا ہے اور اُنہوں نے مجھے کچھ فوجی راز بتا رکھے ہیں۔ اِن حالات میں اگر میں انڈیا چلی گئی تو پاکستان کو خاصا نقصان پہنچا سکتی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ ایک مشکل معاملہ تھا۔ پونچھ ہاؤس میں رہنے والوں کو یقیناً اس بارے کچھ پتا نہیں تھا اس لیے اُن کے راز انتہائی بچگانہ ذہن کو بھی نہیں اُکسا سکتے تھے۔ بہر حال اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اب پاکستان کی فوج سے متعلق سارے راز محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ان لوگوں سے گفتگو کی تھی جو شیخ عبداللہ کی حکومت کے لیے بہت جذباتی تھے۔ دراصل اس اُمید پر کہ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گی انہوں نے مجھے پیغامات دیئے جو مجھے ذاتی طور پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ کو پہنچانے تھے۔

ہماری گاڑی جیل کے سامنے جا کر رُکی اس لیے جس پولیس آفیسر نے ہمیں جیل کے اندر داخل کیا، کی شائستگی بالکل بے جا اور غیر ضروری تھی۔ اور اُس نے ایک ایسے مہربان کی طرح اعلان کیا جیسے وہ ہماری کوئی مدد کر رہا ہو۔

''آپ کو بی کلاس دی جائے گی لیکن مجھے یقین نہیں کہ آپ کے ملازم بھی آپ کے ساتھ رہ سکیں گے۔''

''ایسی صورت میں ہم سب اُسی کلاس میں رہیں گے جس میں ملازم رہیں گے۔'' میں نے اُسے بتایا۔ میں جانتی تھی کہ اگر ملازموں کو ہم سے الگ کر دیا گیا تو ہم اُنہیں دوبارہ کبھی نہیں مل سکیں گے۔ وہ ہمیں ایک اندرونی صحن میں لے گیا جس کے اردگرد ایک باغ بھی سجا ہوا تھا۔ اس کی ایک طرف چار کمرے تھے جن کے سامنے ایک برآمدہ تھا، ہمیں دے دیئے گئے۔ کمرے صاف سُتھرے تھے اور یہاں باغ کے پھولوں کی وجہ سے ایک بے جوڑ سی شان وشوکت ٹپکتی تھی۔ ہم ابھی اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ پولیس آفیسر نے مجھے کہا کہ میں تمام زیورات اور پیسے اُس کے حوالے کر دوں اور یہ بھی کہا۔ ''جب میں رہا ہوں گی تو یہ مجھے واپس مل جائیں گے۔''

مجھے اپنے شوہر سے جدا ہوئے ٹھیک تین ماہ ہو چکے تھے۔ میں نے اُن کی یاد میں اپنے کمروں ہی میں کچھ قیدیوں کو کھانا کھلایا۔ اُسی روز میں نے سُنا کہ باپو (مہاتما گاندھی) نے ہندوستان اور پاکستان کے بہتر تعلقات کے حق میں مرن بھرت رکھا ہوا ہے۔ تاہم کچھ آفیسروں نے اِس خبر کو مجھے زِچ کرنے کے لیے استعمال کرنے کوشش کی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ملک دہری پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ آپ کے اپنے لوگوں کو احساس ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔'' میں اُنہیں یہ بتانے کی جراءت نہ کر سکی کہ پاکستان کے حکمران اپنے گریبان میں جھانکے بغیر خود بھی اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔

ڈراؤنا خواب

ہمیں جیل میں دو ہفتے ہو گئے لیکن اس عرصہ میں میں نے کسی شرمناک اور قابلِ نفرت حادثے کے بارے نہیں سُنا۔ میں اس خیال میں گم ہو جاتی تھی کہ میں نے یہاں آ کر مظفر آباد کے دوستوں کو ذلیل کیا۔ جب جموں کا تصوّر تھکے ہوئے ذہن پر حملہ کرتا تو میں مصیبت کے دنوں کے فاقے کی خواہش کو پرے نہ جھٹک سکتی۔ کچھ وقت کے بعد ہوش ٹھکانے پر آتے تو یہ سب غور و فکر عیاشی معلوم ہوتا تھا۔ جموں کے خوش کن انتظار اور مظفر آباد کے بارے احساس جرم کے ذریعہ ہستی نے اپنے جواز کے ذرائع تلاش کر لیے تھے۔ زندگی میں معنویت کی تلاش کا یہ ایک متبادل راستہ تھا۔

جب انسپکٹر اندر داخل ہوا تو اُس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ''خوش ہو جائیں! آپ کے لیے اچھی خبر لایا ہوں۔'' اُس نے کہا۔ ''آپ لوگ آج ہی جموں کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ مہربانی کر کے اپنا سامان باندھ لیں۔''

میں جموں کے بارے اتنے طویل عرصہ سے سوچتی رہی تھی کہ اب یہ خواہش اور یہ خیال بوسیدہ ہو کر دم توڑنا شروع ہو گئے تھے۔

چار بجے بعد از دوپہر ایک سٹیشن ویگن ہمیں لینے کے لیے آ گئی۔ جیل چھوڑنے سے قبل انسپکٹر نے میرے زیورات اور رقم واپس کر دی۔ ہم ویگن میں کمشنر کے بنگلے پر گئے تو ہمیں کہا گیا کہ ہم کسی بھی قسم کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ ایک کوچ تھی جو بالکل بند تھی اور اس میں روشندان نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور پھر بھی انسانوں سے چھلک رہی تھی۔ آپ کو دو مسافروں کے درمیان اپنی جگہ بنانے کے لیے دھکم پیل، کہنی مارنا اور سکڑنا پڑتا تھا۔ فضا ایسی اُمید سے جو ہر دل میں اور ہر چہرے پر نمایاں تھی معطّر محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اب جب کوچ کا دروازہ بند ہوا تو میں اپنے آپ کو وقتی طور پر باسی پسینے سے پیدا ہونے والے اور تیزی سے پھیلنے والے تعفن کے بوجھ تلے دبی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

میرے سارے ہم سفر مسلمان تھے اور اُن میں سے ایک کو جو مظفر آباد سے ہمارے ساتھ آیا تھا میں نے پہچان بھی لیا۔ میں نے اُس سے دیگر مسافروں کے سفر کی وجہ اور منزل وغیرہ کے بارے معلومات حاصل کیں۔ اُس کا جواب برمحل نہیں تھا۔ اس کے برعکس اُس نے بس میں موجود آفیسروں اور اُن کے رشتہ داروں کے بارے لمبی کہانی سنائی۔ ''اِن میں سے ایک میرپور کا وزیر ہے اور اُس کا بھائی پشاور کا وزیر اعظم (وزیر اعلیٰ) ہے۔ یہاں ایک پولیس سپرینٹنڈنٹ بھی بیٹھا ہوا ہے۔''

ہماری گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشوں پر پردے لگے ہوئے تھے اور ہمارا قافلہ جا رہا تھا۔ پہلے ایک موٹر کار نکلی جس کے پیچھے سپاہیوں سے بھرا ہوا ٹرک تھا۔ ہماری بس اور ایک گاڑی اِن کے پیچھے چل رہی تھیں۔ ہم نے رات جہلم میں گزاری۔

میں نے صبح اپنے مظفر آباد والے ساتھی سے پوچھا۔ ''ہم جموں باڈر پر کب پہنچیں گے؟'' اُس نے کہا۔ ''ہم تو میرپور جا رہے ہیں۔'' لحہ بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید اس آدمی نے یہ اندازہ کر لیا ہو کہ میں جموں پہنچنے کے لیے بیتاب ہوں اس لیے یہ مجھے تنگ کر رہا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے میں نے ڈپٹی کمشنر سے ملنے کے لیے کہا۔

''آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

''واقعی ہم میرپور جا رہے ہیں۔ اُس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔'' یہ بہت غلیظ حربہ ہے۔ ہمیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ہم جموں باڈر پر جا رہے ہیں۔''

اُس نے کہا۔ ''آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دیا جا رہا۔'' وہ اِس موضوع پر زیادہ بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اُس نے کہا۔ ''شاید آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں کشمیر میں جج رہا ہوں۔ مجھے اچھے وقتوں میں معلوم ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اس لیے میں نے اپنی فیملی پشاور منتقل کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مہتا صاحب کو بھی سب معلوم تھا۔ اُنہیں بھی یہی کرنا چاہیے تھا۔''

''معاف کیجئے۔ لیکن مہتا صاحب اِس بارے بہت مضبوط مؤقف رکھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمیں کہیں اور بھیجنے کی وجہ سے دوسرے لوگ جن کی وہ دیکھ بھال کر رہے تھے بے عزتی محسوس کریں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہمیں بھی دیگر لوگوں کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس صورتِ حال کو اس طرح بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔''

میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اُس نے میری آواز کے زیر و بم کا نوٹس ہی نہیں لیا یا اُسے نظر انداز

کر دیا۔اُس نے صرف یہ کہا۔''مجھ پر یقین کریں کہ آپ کو بالکل فکر نہیں کرنی چاہیئے، میرا خیال ہے آپ نے سنا ہوگا کہ علی بیگ کیمپ دنیا کا جہنم ہے۔ہم آپ کو وہاں نہیں رکھیں گے۔دتیال میں ایک ٹھیکیدار ہے، وہ بہت خوش حال آدمی ہے۔اُس نے اپنا ایک بڑا گشتی مکان بازیاب خواتین کے لیے مختص کیا ہے۔آپ چوں کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی قیدی ہیں اس لیے آپ کو راولپنڈی میں نہیں رکھا جاسکتا۔دتیال سے ہندوستان جانا زیادہ آسان ہے۔''

جب منسٹر میرے ساتھ بات کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وینا اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔وہ اُسے پہچان گئی اور کہا۔''آپ کی بیٹی بھی میری ہم جماعت تھی۔اب وہ کہاں ہے؟''

''وہ سب پشاور میں ہیں۔آپ کے لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، میرے بچے! بالکل فکر نہ کریں۔''

میرے لیے مسز مودی کو یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ ہم اب بھی مصیبت سے نہیں نکلے۔میں نے اپنے آپ کو معمولی چور کی طرح محسوس کیا جو اپنے جرم کا اعتراف کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔میں نے اُسے کمشنر کے ساتھ گفتگو کے بارے بتایا اور ساتھ ہی کہا۔''مجھے اب بھی معلوم نہیں کہ ہمیں مزید کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سب کو مظفر آباد سے دُور لے کر آ گئی ہوں۔''مسز مودی زیادہ حوصلہ افزائی کے موڈ میں نہیں تھی۔وہ خاموش رہی۔اُس نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ میں اب بھی اپنے کیئے پر پچھتانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

جب اندھیرا مکمل چھا گیا تو ہم دتیال کے لیے روانہ ہوئے۔ہمارا ٹرک رضائیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہم انہی پر بیٹھ گئے۔ہم نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہے تھے اور بس ایک پُراسرار چیخ کے ساتھ تند و تیز آندھی کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔بچے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے تھے اور جو زیادہ چھوٹے تھے وہ خوفزدہ ہو کر رونا شروع کر دیتے تھے۔ڈرائیور قبائلیوں کے جتھوں، جو سڑک کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے، سے بچنے کے لیے بار بار بریکوں کو زور لگا کر دباتا تھا۔وہ اس کو راستہ دیتے ہوئے اُس پر چیختے بھی تھے۔

بالآخر جب ٹرک رُکا تو وزیر جو کار میں آ رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا۔''دتیال یہاں سے صرف دو میل ہے اور باقی راستے پر گاڑی نہیں چل سکتی۔اب آپ کو پیدل جانا پڑے گا۔مجھے افسوس ہے کہ میں تو آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا لیکن میرا ایک آدمی آپ کے ساتھ وہاں تک جائے گا۔اوہ! لیکن آپ کے ملازم آپ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔مردوں کو اُس کیمپ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں نے اُس کو بتایا کہ میں کسی بھی حال میں اپنے ملازموں سے علیحدہ نہیں ہوسکتی۔

اُس نے ہار مان لی۔ ''ٹھیک ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''میں آپ کو اس کلیے سے مستثنیٰ کر دوں گا۔ جب منگل بھائی کی فیملی کیمپ میں گئی تو جاگیردار کو اُن کے ساتھ کیمپ میں نہیں رہنے دیا گیا اور اُسے علی بیگ کیمپ میں جانا پڑا۔ بعد میں وہ وہاں مُردہ پایا گیا۔''

ہم نے اپنی چند چیزیں اکٹھی کر کے اُٹھائیں اور مین روڈ سے دُور نکل گئے۔ ایک تنگ پیدل راستہ گندم کے کھیتوں سے گزرتا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ کو یہاں کسی طرح بھی شور نہیں کرنا۔ جتنی آہستگی اور خاموشی سے چل سکتی ہیں چلیں۔ کسانوں کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کوئی تجاوز کر رہے ہیں۔ اگر اُن کو معلوم ہو گیا تو میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ وہ گرمجوشی سے ہمارا استقبال نہیں کریں گے۔ وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔'' قسمت نے یاوری کی اور ہم قدم قدم اُٹھاتے چوری چُھپے جیسے ہم کوئی بڑا کھیل کھیل رہے ہیں، چلتے گئے۔ میں اُس وقت ذرا چونک گئی جب میرے پاؤں کے نیچے آنے کی وجہ سے لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے نے چٹخنے کی آواز دی اور گائیڈ بار بار پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے میرے تیز اور بھاری سانسوں کی آواز کو بھی پسند نہیں کیا۔ ہم کیمپ میں پہنچنے سے پہلے تقریباً دو میل چلے ہوں گے اور ایک سنتری ہمیں اندر لے گیا۔

یہ عمارت تقریباً سڑک ہی پر کھڑی تھی اور ہم نے اپنے آپ کو ایک مدّھم روشنی والے کمرے میں پایا۔ یہ عمارت کیا تھی انسانوں کا کباڑ خانہ تھا جس میں گنجائش سے کہیں زیادہ لوگ بند کر دیئے گئے تھے۔ کچھ خواتین آنکھیں بند کر کے دُنیا ومافیہا سے بے خبر چار زانوں ہو کر بیٹھنے پر مجبور تھیں اور کچھ اپنے سروں کو گھٹنوں میں دبا کر گہری سوچ و بچار میں تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک خاتون پشیمانی اور افسوس کے عالم میں ایک روتے چلّاتے بچے کو خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے ایک ایسی التجا کا تاثر ملتا تھا جیسے وہ آسمان سے رحم اور دُنیا کے خاتمے کی بھیک مانگ رہی ہو۔ چند خوش نصیب خواتین جو محض دُکھ درد سے اُکتائی ہوئی تھیں وہ گھاس کے بستر پر سوئی پڑی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف ناگوار نیلی ہوا پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ایسے بادل کی طرح تھی کہ پہاڑ پر چڑھتا ہوا آدمی اُسے چھو سکتا ہو۔

سب آنکھیں بیٹری (Battery) کی طرح مجھ پر گاڑھ دی گئیں۔ کچھ خواتین نے جو اپنے آپ سے بیزار معلوم ہوتی تھیں اسی انداز میں ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دیگر نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میرے اندر کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ چند کے علاوہ دیگر تمام جوان تھیں لیکن اُن کے شباب کی ساری تابانی ماند پڑ چکی

مسترد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ سب اُس عورت کی طرح محسوس کرتی تھیں جسے اپنے اُس شوہر نے گھر سے نکال دیا ہو جس کے ساتھ وہ کسی پُر اسرار خوف کی وجہ سے محبت کرتی تھی اور اب ایک ایسے شخص کی بانہوں میں چلی گئی ہو جس کی نہ اُسے کوئی خواہش اور نہ ہی اس کے ساتھ ہم آہنگی (Understanding) ہو۔ اُنہیں شدت سے اپنی نظروں میں اہمیت اور قدر و قیمت حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر حکومت کے کارندے بھی اِن خواتین پر بُری نظر رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً کیمپ میں آتے جاتے تھے لیکن کیمپ کمانڈر نے مختلف طریقوں سے اُن کے راستے میں مشکلات کھڑی کی ہوئی تھیں۔ یہ کیمپ کمانڈر ایک پچاس سالہ اُونچے قد کا آدمی تھا۔ عمر نے اُس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ایک ایسی مشفق شخصیت کا مالک تھا کہ دیکھنے والا اُس کی شرافت پر یقین کرنے لگتا تھا۔ میں نے اُس کی بہت تعریف سنی تھی اُسے ٹھیکیدار کہتے تھے۔☆

ظاہر ہے اُسے بھی میرے بارے کچھ علم تھا اس لیے اُس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اُس نے کہا۔ ''اچھا! تو آپ کو بھی یہیں لایا گیا ہے! آپ کے حق میں اپنی پوری کوشش کروں گا لیکن پھر بھی آپ کو متنبہ ضرور کروں گا کہ اس کیمپ میں زندگی آسان نہیں ہے۔ قبائلی کثرت سے یہاں آتے ہیں اور میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اُنہیں کیمپ سے دُور رکھوں جو میں کسی نہ کسی طرح کر رہا ہوں۔ کئی بے حد خوبصورت خواتین بھی یہاں ہیں اُن کے مسلمان شوہر مسلسل اُن کا پیچھا کر رہے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اُنہیں واپس حاصل کریں اور عجیب بات یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی واپس اُنہی کے پاس جانا چاہتی ہیں۔''

میں نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ خواتین ذہنی طور پر نارمل نہیں ہیں اور آپ نے اس بات کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ اُن کا ذہن محبت اور خوف کے درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ سماجی طور پر اچھوت پن (Boycott) کا شکار ہونے سے ڈرتی ہیں اس لیے اپنے مسلمان شوہروں کے پاس واپس جانے کو محفوظ راستہ سمجھتی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ آپ کا کیا مطلب ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اپنی پوری کوشش کروں گا کہ وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنے مستقبل کا انتخاب کریں۔ پاکستان کی حکومت نے مجھے اِس کیمپ کی حفاظت کے لیے مطلوبہ تعداد میں محافظ فراہم نہیں کیے۔ آپ اچھی طرح تصور کر سکتی ہیں کہ میرے لیے تنہا اس ویرانے

☆ ٹھیکیدار خواجہ عبدالعزیز آف دتیال نزد کھڑی شریف۔

میں اتنی بے شمار خواتین کی حفاظت کتنا مشکل کام ہے۔اب ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا جائے۔پہلی منزل بالکل پُر ہے۔یہ کمرہ گیٹ سے بالکل قریب ہے اس لیے محفوظ نہیں لیکن آج رات آپ یہاں سو سکتی ہیں۔کل میں آپ کے لیے اپنے ساتھ والا کمرہ خالی کروادوں گا۔کافی دیر ہو چکی ہے اس لیے مجھے چلے جانا چاہیے۔''

ہمارا کمرہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ملازمین نے لوہے کے صندوق کونے میں ڈھیر کیے اور ہمارے سونے کے لیے فرش پر خشک گھاس بچھادی۔جب تاریکی ہوگئی تو مجھے یہاں آنے کے بعد پہلی مرتبہ ڈر سا لگا۔میرے ذہن میں اُن خونچکاں کہانیوں کی تفصیل جو میں نے بعد از دوپہر سنی تھیں ایک ایک کر کے گھومنے لگیں۔اب وہ کہانیاں میرے اپنے تجربات کا حصہ بن چکی تھیں اور میں نے پوری شدت سے اُنہیں اپنے تصوّرات میں جگہ دے دی تھی۔میں نے اس غلیظ ڈرامہ کے کرداروں کو خوف کے مارے بدل دیا اور پھر اس ڈراؤنے خواب سے نئی شروعات کے لیے جاگ اُٹھی۔

دن کے پہلے حصے میں جب میں خواتین سے ملی تو مجھے اُن کی صحیح صورتِ حال سمجھ میں آئی۔اب میں خود اُن کی زندگی کے تجربات سے گزرنے لگی تھی۔میں شکر گزار تھی کہ حقیقی معنوں میں اُن کے دکھوں کو محسوس کر سکی۔مجھے یہ بات اچھی لگی کہ کسی دوسرے کے دُکھ درد پر رولینے سے اپنے دکھ درد کم اور غیر اہم محسوس ہونے لگتے ہیں۔مجھے لگا کہ میں نے قسمت کی بازی ابھی ہاری نہیں ہے اس لیے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اِن بدنصیب خواتین کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔مجھے کوشش کر کے انہیں ذہنی طور پر دوبارہ نارمل حالت میں لانا چاہیے۔

شام کے وقت گوبند پور کالج کے دو نوجوان لڑکے کیمپ میں آئے۔وہ سماجی کارکن تھے اور اُن میں ایک میر پور کے وزیر کا بھتیجا تھا۔

''آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اور آپ کی آنکھیں اس قدر سُوجھی ہوئی ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''کیا آپ کا خیال ہے کہ کوئی آدمی یہاں خوش بھی رہ سکتا ہے؟ ذرا اس کیمپ میں قید خواتین پر نگاہ ڈالیں۔اُن کے پاس کپڑے تک نہیں ہیں اور کھانے میں اُنہیں دو روٹیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔وہ شدید تھکاوٹ کے باعث سوتی ہیں اور کیا آپ توقع رکھتے تھے کہ تالیوں کی گونج میں آپ کا استقبال کیا جائے گا؟'' کبھی کبھی دکھ درد کی شکایت کرتے ہوئے رونا بھی پڑتا ہے۔چنانچہ میرے اس انداز نے اپنا کام کیا۔لڑکا خود بھی بے آرامی اور دکھ محسوس کرتا ہوا دکھائی دیا اور وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا۔اُس نے کہا۔''جو کچھ ہو چکا ہے اُسے بھول جائیں۔ہم یہاں آپ کی دیکھ بھال کرنے آئے ہیں میں جانتا ہوں کہ یہاں کے حالات بہت

خراب ہیں لیکن اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ علی بیگ کیمپ کا کیا حال ہے تو آپ اپنے کو خوش قسمت سمجھنے لگیں گی۔"

"لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں جنہیں آسانی سے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ گارڈز عورتوں کے ساتھ بہت بدتمیزی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اِن خواتین کو کچھ کپڑے اور چادریں تو دے ہی سکتے ہیں۔" کمانڈر بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے گارڈز کو بُلایا اور کہا کہ اگر آئندہ اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی ہے تو وہ اُسے گولی مار دے گا۔ جب وزیر ایک مرتبہ کیمپ کا معائنہ کرنے کے لیے آیا تو اُس نے پرانی رضائیاں واپس جمع کر کے نئی رضائیاں تقسیم کیں۔

22

سوشل بائیکاٹ کا خوف

کیمپ کمانڈر اپنے کام کو بہت سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وہ یوں تو صرف ایک منتظم تھا لیکن انتہائی صاف وشفاف انسانی روّیے کا حامل تھا اور کیمپ میں محصور خواتین کے مسائل کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ اس وجہ سے مسلسل پریشان رہتا تھا کہ کیمپ کے حالات اچھے نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں کسی ذمہ دار شخصیت سے بات ہونی چاہیے۔ دتیال سے چار میل کے فاصلے پر گوبند پور کا گاؤں تھا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کا ایک ضلعی ہیڈکواٹر بھی تھا۔ اکثر آفیسر اور پولیس کے سپاہی قبائلی تھے جو حملہ آوروں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے جو اُن ہی کے علاقے کے لوگ تھے۔ اس لیے وہ امن وامان قائم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ آور مقامی لوگوں کو لوٹ کر اور ان کے مال مویشی چھین کر اُنہیں ذبح کر لیتے تھے جبکہ آفیسر اُن کے خوف سے ذرہ بھر مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک شام کو کمانڈر میرے پاس کافی دیر بیٹھا رہا اور تفصیل سے باتیں کیں۔ اُس نے کہا۔ ''یہاں اکثر عورتیں ایسی ہیں جو ہندوستان نہیں جانا چاہتیں لیکن بہت سی جانے کے لیے بیتاب بھی ہیں۔ اب اُن سب سے سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سوال وجواب ہوں گے اور اُن کے بیان ریکارڈ کیے جائیں گے۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنانا چاہتیں اُنہیں اپنے اُن مسلمان شوہروں کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا جن سے چھین کر انہیں لایا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ بہت ہی عجیب وغریب اور خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کے انتخاب کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کبھی یہ خواتین بہت اچھی زندگی گزار رہی تھیں۔ اُن کی بہت اچھی طرح پرورش کی گئی ہے اور نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ ہیں۔ اب وہ نہایت عام لوگوں کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں جن کے ساتھ زندگی گزارنے کی اُنہیں عادت نہیں تھی۔ اِن میں اکثر لوگ اجڈ اور گنوار قسم کے تھے جنہوں نے اِن عوتوں کو چھپر پھاڑ کر ملنے والی جائیداد سمجھا ہوگا۔ وہ مقابلے کا جوہر کھو بیٹھی ہیں اور بالکل کمزور اور بزدل ہو چکی ہیں۔ اگر اُنہیں ذرا بھی احساس ہوتا کہ نئے شوہروں کے پاس واپس جانے

22

سوشل بائیکاٹ کا خوف

کیمپ کمانڈر اپنے کام کو بہت سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وہ یوں تو صرف ایک منتظم تھا لیکن انتہائی صاف وشفاف انسانی روّیے کا حامل تھا اور کیمپ میں محصور خواتین کے مسائل کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ اس وجہ سے مسلسل پریشان رہتا تھا کہ کیمپ کے حالات اچھے نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں کسی ذمہ دار شخصیت سے بات ہونی چاہیئے۔ دتیال سے چار میل کے فاصلے پر گوبند پور کا گاؤں تھا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کا ایک ضلعی ہیڈ کواٹر بھی تھا۔ اکثر آفیسر اور پولیس کے سپاہی قبائلی تھے جو حملہ آوروں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے جو اُن ہی کے علاقے کے لوگ تھے۔ اس لیے وہ امن وامان قائم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ آور مقامی لوگوں کو لوٹ کر اور ان کے مال مویشی چھین کر اُنہیں ذبح کر لیتے تھے جبکہ آفیسر اُن کے خوف سے ذرہ بھر مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک شام کو کمانڈر میرے پاس کافی دیر بیٹھا رہا اور تفصیل سے باتیں کیں۔ اُس نے کہا۔ ''یہاں اکثر عورتیں ایسی ہیں جو ہندوستان نہیں جانا چاہتیں لیکن بہت سی جانے کے لیے بیتاب بھی ہیں۔ اب اُن سب سے سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سوال وجواب ہوں گے اور اُن کے بیان ریکارڈ کیے جائیں گے۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنانا چاہتیں اُنہیں اپنے اُن مسلمان شوہروں کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا جن سے چھین کر انہیں لایا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ بہت ہی عجیب وغریب اور خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کے انتخاب کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کبھی یہ خواتین بہت اچھی زندگی گزار رہی تھیں۔ اُن کی بہت اچھی طرح پرورش کی گئی ہے اور نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ ہیں۔ اب وہ نہایت عام لوگوں کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں جن کے ساتھ زندگی گزارنے کی اُنہیں عادت نہیں تھی۔ اِن میں اکثر لوگ اجڈ اور گنوار قسم کے تھے جنھوں نے اِن عورتوں کو چھپر پھاڑ کر ملنے والی جائیداد سمجھا ہوگا۔ وہ مقابلے کا جوہر کھو بیٹھی ہیں اور بالکل کمزور اور بزدل ہو چکی ہیں۔ اگر اُنہیں ذرا بھی احساس ہوتا کہ نئے شوہروں کے پاس واپس جانے

کے بارے اُن کا انتخاب کیا ہونا چاہیے تو میں اتنا ناخوش نہ ہوتا۔ مجھے حیرت ہوگی اگر آپ اِن میں یہ احساس پیدا کر سکیں کہ اُنہیں فرسودہ اور قدامت پسند جنتا کی نفرت کے خوف سے اپنی کشتیاں نہیں جلانی چاہیں۔''

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں اُس کی مدد کے لیے جو کچھ بھی کر سکی ضرور کروں گی۔

میں نے تمام عورتوں کو اکٹھا کیا کہ ہر صبح اور شام کو دعائیہ اجتماع ہوا کرے گا اور اُن سب کو حاضر ہونا چاہیے۔ اُن میں سے کچھ نے اس خیال کا سواگت کیا۔ دوسری خواتین نے کہا کہ ''ہم اب ہندو نہیں رہیں۔'' میں نے وضاحتاً کہا کہ حمد گانے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اُنہوں نے عقیدہ بدل لیا ہے۔ میں نے اُنہیں یقین دلایا کہ میں اُنہیں دوبارہ ہندو بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

میرا ذہن بالکل صاف تھا کہ مجھے کیا کچھ کرنے کی اُمید ہے۔ وہ اپنے دُکھ کو اکیلی اپنے اندر سمو کر اپنی ساری شخصیت کو زخمی کر چکی تھیں۔ اُنہیں آزادی سے بات کر کے اِن دکھوں کو بھولنے کی ضرورت تھی۔ وہ اس قدر مریض بن چکی تھیں کہ وہ اُن دوسرے لوگوں کی صحبت میں بھی جنہوں نے اُن کی طرح اور اُن کے ساتھ دُکھ اُٹھائے تھے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھیں اور اپنی شخصیت کے مردہ ہیولے (Dead Image) پر آنسوں بہائے بغیر روتی رہتی تھیں۔ اُنہیں دوسروں پر افسوس کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اِس پس منظر میں مجھے دوسرے دن میٹنگ میں کثرت حاضری پر بڑی حیرت ہوئی۔ اُنہوں نے پورے زور سے ہمہ تن گوش ہو کر اس اُمید پر میری گفتگو سننے کی کوشش کی کہ وہ یہاں سے نا اُمید ہو کر واپس جائیں تا کہ اُنہیں اگلی میٹنگ میں نہ آنا پڑے۔ میں نے اختصار کے ساتھ بات کی۔ ''میں ایک دفعہ سری نگر میں ایک سادھو مگن بابا سے ملی۔ اُس نے مجھے چند گیت سکھائے تھے۔ اُن کا موضوع خاص طور پر مذہبی نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ گاتے ہوئے محسوس کریں گی کہ وہ آپ کو خوش اور حوصلہ مند کریں گے اور جلد ہی آپ بھولنا بھی سیکھ جائیں گی۔''

وہ میری پیروی کرتے ہوئے الفاظ دہراتی رہیں۔ گیت گانے میں نہ ہم آہنگی تھی اور نہ ہی ترنم۔ اُن کی آوازوں میں لرزش تھی، وہ تناؤ سے بھرپور تھیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا شاید اس لیے کہ میں یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ اُن کے چہروں کی لکیریں قدرے آسودہ ہو جائیں، اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ خالی آنکھوں سے گھورنا بند کر دیں۔ وہ میرے اردگرد جمع ہو گئیں اور دوستانہ روّیے کا اظہار کرنے لگیں۔ وہ اپنے اس لاشعوری عزم کو کہ وہ اپنے دُکھوں سے جُدا نہیں ہوں گی، کو بھول چکی تھیں بلکہ اُس کے بارے باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں دوزانوں ہو کر فرش پر درمیان میں بیٹھ گئی اور اُنہیں بھی اپنے اردگرد بٹھا لیا۔ عجیب بات ہے کہ اُن کی گفتگو سے درد کا کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے تکلیف اور دکھ کا ذائقہ پہلے ہی

چکھ چکے تھے اور اُسے اچھی طرح سمجھتے بھی تھے۔ اس لیے اِن کی خشک اور بدمزہ تفاصیل کو مزید پھیلانے سے منہ کا ذائقہ اور بھی خراب ہوتا تھا۔ وہاں ایک عورت ایسی تھی جس کا شوہر بچے اور والدین سب قتل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ ایک شام کو حملہ آوروں نے اُس کے گاؤں کو محصور کر کے اُنہیں حیرت میں ڈال دیا۔ اُنہوں نے ہر چیز کو وحشیانہ پاگل پن اور جشن کے انداز میں تباہ و برباد کیا۔ لوگ اپنے گھروں میں باورچی خانوں میں اور بستروں کے نیچے چھپ گئے۔ حملہ آوروں نے ہر طرف تباہی مچادی، روپے اور کپڑے لوٹ لیے، لوگوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ قاتل کا کلہاڑا اُن کے جھکے ہوئے جسموں پر ایک زوردار آواز کے ساتھ پڑنے لگا اور وہ بے ہوش ہوتی ہوئی خواتین کو زبردستی یہ منظر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ''ایک کافر کی زندگی اس قابل نہیں ہے کہ اُس پر چھ آنے کی گولی ضائع کی جائے۔'' قاتل اور ڈاکو جب اپنے فعل بد کی اس طرح تشریح کرتا تھا تو اُس کے ساتھی زوردار قہقہہ لگاتے تھے۔ اس کے فوراً بعد قاتل کافروں کی بیویوں سے شادی کی رسم ادا کرنے لگتے تھے۔ اُس شوہر کی بیوی جس کے خون کے گرم گرم قطرے اب بھی بہہ رہے تھے۔ ''میں مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ کاش میں وہ قہقہہ کبھی نہ سُن سکتی۔'' اُس خاتون نے کہا اور اپنے کانوں کو اپنی انگلیوں سے بند کر دیا۔ اُن بھدّے اور کھردرے قہقہوں نے اُس کی بوجھل یادداشت کو اس طرح کچلا ہوا تھا جیسے اُداسی کے گیت کی سُریں مدّھم اور دبی دبی سی ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ تھم کر بار بار بلند ہونے کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔

ہم ہر صبح اور شام کو ملنے لگیں اور رفتہ رفتہ خواتین کو باہر کی دُنیا اور اُس میں انسانیت کے بارے معلوم ہونا شروع ہوا۔ مجھے اُس وقت شکر گزاری کا احساس ہونے لگا جب کبھی کبھی میں خواتین کو ہوا میں چٹکی لے کر کوئی رائے دیتے ہوئے یا دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ کسی کے مذاق کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتی یا سنتی۔ اُن میں سے کچھ نے مجھے بتایا کہ وہ خوش خوش اس میٹنگ کا انتظار کرتی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کیمپ میں حالات بہتر ہونے لگے۔ اگرچہ ہمیں اتنا کچھ نہیں ملتا تھا جو ہماری ضرورت تھی پھر بھی ہمیں کھانے کے لیے بہتر کھانا ملنے لگا۔ ہم صاف سُتھری چادروں پر نہیں سوتی تھیں لیکن ہم رات بھر سردی سے کانپتے ہوئے بھی نہیں گزارتی تھیں۔ رات کی نگرانی مزید سخت کر دی گئی اور جب ہم صبح سو کر اُٹھتی تھیں تو ہماری نیند پہلے سے زیادہ پُرسکون ہونے لگی۔

خواتین برابر کیمپ میں آرہی تھیں جس کی وجہ سے ہماری تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ دوسری خواتین کو جنھوں نے بالکل انہی کی طرح مصائب برداشت کیے دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔ اب

مجھے سمجھ آنے لگی ہے کہ بہت سی خواتین دوبارہ مسلمانوں کے گھروں میں جانے کے معاملے میں خاموشی سے رضامند کیوں ہو جاتی تھیں۔ اُن کے مسلمان شوہروں نے اُنہیں ڈرا دھمکا کر یہ یقین دلایا ہوا تھا کہ تمہیں یہاں سے نکال کر کیمپ میں لے جانے کی باتیں محض دھوکہ ہیں۔ اُن کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اُنہیں دوسرے قبائلیوں کے حوالے کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اگر انہیں ہندوستان لے جایا بھی گیا تو اُنہیں بہر حال نفرت کا نشانہ بننا پڑے گا۔

نئی آنے والیوں سے نبھاؤ بہت مشکل تھا۔ وہ میٹنگ میں بہت کم آتی تھیں اور مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تشکیک کی یہ فضا زیادہ پھیل نہ جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُن کی زندگیوں میں اُمید کی کرن جگاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ اُن کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ وہ اپنی ہستی سے دستبردار ہو کر مسلمان شوہروں کے ساتھ ناخوشگوار زندگی گزارنے پر صرف اس لیے تیار ہو جائیں کہ اُنہیں مستقبل کا خوف ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ میں نے انہیں اس راہ پر ڈال دیا تو وہ دوسروں سے زیادہ تیزی سے بحال ہونے لگیں۔

پہرے دار ہمارے خلاف بغض رکھتے تھے کیوں کہ ایک مرتبہ میں نے کمانڈر سے اُن کی بدتمیزی کی شکایت کی تھی۔

جب وہ نہیں ہوتا تھا تو وہ خواتین کے ساتھ بدتمیزی کرتے تھے اور اُن سے معمول سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اکثر خواتین جنہیں گھروں میں ملازم رکھنے کی عادت تھی اور فارغ البال گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس صورت حال سے ناراض تھیں اور مجھ سے شکایت کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اس بارے کمانڈر سے بات کروں۔

میں نے اُنہیں بتایا۔ ''لیکن یہ کوئی سخت یا بُرا کام نہیں ہے۔ دراصل میں تو ہر روز اپنا کمرہ صاف سُتھرا کرنے کے بعد بہتر محسوس کرتی ہوں۔ آخر کار ہم ہی یہاں رہتی ہیں اور گھر بہت بے رونق اور غلیظ لگتا ہے۔ یہ آپ کے لیے بے حد مفید ہوگا کہ آپ پکا ارادہ کر لیں کہ آپ رات دن سوچتے سوچتے گزارنے کے بجائے کچھ نہ کچھ کرتی رہیں گی۔'' اس طرح ہر صبح ہم کمرے میں جھاڑو پھیرتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں اور ''پوچا'' مارتی تھیں۔ اُنہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ سب کام کرنے کے بعد وہ زیادہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔

گاؤں کی مسلمان خواتین بھی اکثر ہمارے کیمپ میں آتی تھیں اور ہمیں طویل گفتگو میں مصروف رکھتی تھیں۔ وہ اُن ہندو لڑکیوں سے حسد کرتی تھیں جنہیں اُن کے گھروں میں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے شوہر پہلے کی طرح اُن پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

میں نے اُنہیں بتایا۔ ''اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں اس قدر بے بس نہ ہوتی۔ یہ صورت حال

سوائے آپ کے خودغرض شوہروں کے، جن کی ہوس کا کوئی ٹھکانہ نہیں، کسی کے لیے بھی موزوں اور قابلِ قبول نہیں۔ آپ کو کوشش کر کے ایسی شادیوں کو رکوانا چاہیے۔ آپ کے گھروں کو ایسے مداخلت کاروں کے ذریعے توڑا جا رہا ہے جو خود بھی مداخلت کے لیے رضامند نہیں ہیں جس کی وجہ سے نہ تو پہلی بیوی پرسکون ہے اور نہ دوسری۔'' وہ فوری طور پر میرے ساتھ متفق ہوگئیں، واپس گھر گئیں اور اپنے شوہروں سے جھگڑا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد انہوں نے باقاعدگی سے دیگر اغواء شدہ ہندو لڑکیوں کا اَتہ پتا بتانا شروع کر دیا۔ ہر صبح سپاہیوں کا ایک دستہ نکلتا اور چار پانچ لڑکیوں کو تلاش کر کے لے آتا۔ کیمپ کمانڈر اچھی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا اور اگر اُس نے مجھے پوری آزادی نہ دی ہوتی تو یہ سب ناممکن تھا۔

اگرچہ ہمارے کیمپ کی زندگی نسبتاً محفوظ تھی۔ لیکن پڑوس کے گاؤں اب بھی حملہ آوروں کے لیے خوشگوار شکار گاہوں کی طرح تھے۔ ہر چند روز کے بعد قبائلیوں کا کوئی نہ کوئی دستہ نوشہرہ کے محاذ پر جاتے ہوئے گاؤں میں ٹھہرتا۔ دن بھر کی لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کے بعد وہ صبح سویرے تک ناؤ نوش میں مصروف رہتے۔ وہ کبھی بھی کسی گاؤں کا مکمل صفایا کر کے نہیں جاتے تھے بلکہ کچھ نہ کچھ دوسرے چکر کے لیے بھی چھوڑ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ معمول کی زندگی بحال ہونے کے بعد بھی بے شمار قبائلی واپس آ کر لوٹ مار میں اپنا حصہ مانگتے تھے۔ اُن میں ناتجربہ کاری کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اُن کا طرزِ عمل انتہائی تجربہ کار ایذا رسانوں (Sadist) والا تھا۔

ایک دن ہمارے کیمپ کے باہر قبائلیوں کے ایک گروہ اور مقامی مسلمانوں کے درمیان ایک جھڑپ شروع ہوگئی۔ اگرچہ حالات مکمل طور پر حملہ آوروں کے حق میں تھے اور اہلِ گاؤں کو آسانی سے شکست ہوگئی لیکن اُنہوں نے کسی طرح ایک قبائلی کو قتل کر دیا۔ حملہ آوروں نے گاؤں میں کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا اور قسم کھائی کہ واپس جانے سے پہلے ہر ایک کو موت کے گھاٹ اُتار کر جائیں گے۔ اُنہوں نے تمام مویشیوں کو ذبح کر دیا، غلہ کے کوٹھاروں (گودام) کو خالی کر دیا اور تین دنوں میں سب کچھ ہضم کر گئے۔ گاؤں کے لوگ مدد کے لیے مقامی پولیس کے پاس گئے لیکن وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ ذرا بھی مداخلت نہ کر سکے۔ معاملہ مرکزی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا جس نے بالآخر حملہ آوروں کو اگلے مورچوں پر بھیج دیا۔

کئی حادثات میں سے یہ صرف ایک ہے۔ خواتین یہ کہانیاں سُن کر خوف سے کانپتی رہیں۔ ٹھیکیدار کو مرکزی حکومت سے زیادہ مدد نہیں ملی لیکن اس کے باوجود اُس نے ہمیں محفوظ ہونے کا احساس دلانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ وہ ہر کمرے میں گھوم پھر کر سب کو یقین دلاتا تھا کہ جب تک اُس میں ذرا بھی سکت باقی ہے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

23

بالآخر ہندوستان روانگی

پڑوسی گاؤں کے ایک محلّہ سے کچھ مسلمان کپڑے اور پیسے لے کر کیمپ میں آئے۔انہوں نے کیمپ کمانڈر سے اجازت طلب کی کہ وہ چیزیں اُن لڑکیوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جواُن کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں۔کیمپ کمانڈر اُن کی نیّت کے بارے شک میں مبتلا تو تھا لیکن وہ خیرات بانٹنے کی درخواست کو مسترد نہیں کرسکتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ کپڑوں کی تقسیم محض اُن خواتین سے ملنے کا بہانہ ہے۔کچھ خواتین نے کپڑوں کے تحفے قبول کر لیے اور اُن کی تیز رفتار گفتگو سننے کے لیے بھی تیار ہوگئیں۔اُن کی اس گفتگو میں بلند آہنگ الفاظ اور پھیکی اور مکروہ جذباتیّت کے علاوہ کچھ نہیں تھا جو وہ جلدی جلدی اِن خواتین پر مسلط کر رہے تھے۔

وہ سارے مرد پھڑ پھڑاہٹ کی حالت میں تھے اور اُن کی نیک تمنائیں اور عاجزی سب مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں۔اُن کے چہروں سے ہوس جنگل کی آگ کی طرح بھڑک رہی تھی جواُن کی مسلمان بیویوں سے اس لیے بجھائی نہیں جارہی تھیں کہ وہ ایک دوسرے سے واقفیت اور بیزاری کی بُو محسوس کرتے تھے۔وہ ہندو خواتین کو یقین دلاتے تھے کہ وہ اُنہیں کتنا چاہتے ہیں اور اُن کے لیے تڑپ رہے ہیں اور اُن کے لیے اُن کی محبت کتنی پاکیزہ اور خالص ہے۔وہ قسمیں اُٹھا رہے تھے کہ وہ اپنی پہلی بیویوں کو گھر سے نکال دیں گے اور اِن (نئی بیویوں) کے ساتھ مطمئن زندگی گزاریں گے۔یہ مرد اپنی نئی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کچھ اس طرح کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنی پسند کے زیورات سے لاددیں گے۔

وہ جنسی ہوس کی انتہا کے ہاتھوں بیتاب اور بے قرار تھے۔جبکہ اُمید رکھتے تھے کہ اُن کی ہندو بیویاں اِسے خلوص سمجھ کر قبول کرلیں گی۔لیکن خواتین صرف ان کی باتوں سے محظوظ ہورہی تھیں۔کچھ نے دبی دبی ہنسی میں اُن کا مذاق بھی اڑایا لیکن پھر سنجیدہ ہوکر اُن کی ساری گفتگو کو سُنا۔وہ ٹھیکیدار کی نگرانی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھیں اس لیے اُنہوں نے حملہ آوروں کے پاس واپس جانے سے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ ’’وہ سب بہت جلد ہندوستان جانے کے لیے پُر امید ہیں۔‘‘

حملہ آور شوہروں کو غیض وغضب کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ اِن خواتین کو اپنی طاقت پر اس قدر یقین کہاں سے حاصل ہو گیا۔ جسمانی آسودگی کی اُمید سے مایوس ہونے کے بعد اُن کا مذہبی ضمیر بھی غضبناک ہونے لگا۔ ''اچھا تو کافروں کی بیٹیاں ہندوستان جانا چاہتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے جائیں گی۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی پھیل گئی کہ میں اِن خواتین سے باتیں کرتی رہی ہوں۔ اس لیے انہوں نے فوراً نتیجہ اخذ کرلیا کہ دراصل وہ برائی کی جڑ میں ہوں۔ چنانچہ دیوانہ وار اچھل کود کرتے ہوئے وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ مجھے ساری زندگی کے لیے پاکستان میں روک لیا جائے کیوں کہ میں اُن کی نئی شادی شدہ زندگیوں کی خوشی غارت کرنے کی ذمہ دار ہوں۔

بعدازاں اُنہیں ایک اور تدبیر بھی سوجھی۔ اُنہوں نے گاؤں کے لوگوں کے جوش وخروش کو یہ کہہ کر ہوا دی کہ ہندو خواتین کی پاکستان میں بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی جارہی ہے جب کہ جموں میں مسلمان خواتین چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں اور انہیں اگلے مورچوں پر خندقیں کھودنے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ سادہ لوح دیہاتی آسانی سے اس فریب کا شکار ہو گئے اور اُنہوں نے گاؤں میں فتنہ اور فساد شروع کر دیا۔ کیمپ کمانڈر میرے کمرے میں آیا لیکن اُس کا ذہن کسی شک وشبہ میں مبتلا تھا۔ وہ کیمپ کی خواتین کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہو گیا۔ اکیلے نیکی کرنے والے کی حیثیت سے تنہائی کا شکار تھا اور اپنے مثبت اور نیکوکار طرزِ عمل کو مصلحت کے خلاف سمجھنے لگا تھا۔ ''آپ نہیں دیکھ رہیں کہ سارا گاؤں میرے خلاف ہو گیا ہے؟ میں نے آپ لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو میں کرسکتا تھا۔ لیکن کیا آپ جانتی ہیں کہ مسلمان خواتین کے ساتھ جموں میں کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''یہ سوال بہت مشکل اور گھمبیر ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں اسے بالکل سنجیدگی سے نہ لیتی۔ وہ بیقرار اور مایوس ہیں کیوں کہ وہ اپنی ہندو بیویوں کو واپس لے جانے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ شیخ صاحب کسی صورت میں ایسے واقعات کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری بات سے قائل ہوا یا نہیں۔ شاید وہ اپنے آپ کو ایک نیک شخصیت کے روپ میں دیکھتے ہوئے واپس چلا گیا لیکن گاؤں کے لوگوں نے وقتاً فوقتاً اسے پریشان اور تنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک روز ایک ضلعی آفیسر کچھ گندم اور چاول لے کر آیا۔ گندم میں کیڑے پڑے ہوئے تھے اور پکے ہوئے

چاول باسی تھے۔ اُس نے یہ چیزیں کمانڈر کو دکھائیں اور کہا کہ ''آپ اصرار کرتے ہیں کہ ہم اِن خواتین کے لیے اچھی قسم کا راشن ارسال کریں۔ ذرا یہ تو دیکھیں کہ ہماری مسلمان خواتین کو جموں میں کیا ملتا ہے۔''

ایک دن ایک پندرہ سالہ لڑکی ایک سپاہی کے گھر سے برآمد کر کے لائی گئی۔ اُسے اُس کے شوہر اور اُس کے چچا جو مسلمان ہو گیا تھا، کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس لے جایا گیا۔ وہ دیوانہ وار پکار رہی تھی کہ ''میں کیمپ میں واپس نہیں جاؤں گی کیوں کہ وہاں ہندو خواتین ہیں جب کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔'' اُس وقت اُدم بھی وہاں موجود تھا اور ڈپٹی کمشنر نے اُسے کہا کہ اس لڑکی کو کیمپ میں لے جاؤ۔ وہ بُری طرح چیختی تھی اور جانے سے انکار کرتی تھی۔ ''میں نہ تو ہندوستان جاؤں گی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز کھاؤں گی جسے آپ لوگوں نے پکایا ہو۔'' اُس نے بچے کی طرح چیختے ہوئے کہا۔

ایک خاتون نے کوشش کی کہ وہ معقولیت کا راستہ اختیار کرے لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور مسلسل روتی رہی۔ وہ اس طرح روتی تھی جیسے کوئی زور زور سے قے کر رہا ہو اور ہر آہِ سرد کی ہچکی کے ساتھ اپنی ساری نا اُمیدی اور مایوسی کو باہر پھینک رہا ہو۔

میں نے اُسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ میرے کمرے میں چلے اور یہ بھی کہ کوئی اُسے زبردستی ہندوستان جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں کوئی بھی ہندوستان جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو کہ تم کہاں رہنا چاہتی ہو۔'' ایک ایسے بچے کی طرح جسے پیار کر کے بہلایا گیا ہو، وہ خاموش ہو گئی۔ وہ گٹھڑی سی بن کر کمرے کے ایک کونے میں سمو گئی اور اُس کی شریانیں کسی کوڑے کی رسی کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ اُسے کسی رحم کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس وہ رحم کے خلاف مزاحمت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی تحقیر نے رنج و غم کو اس کے دل کی گہرائیوں میں گلنے سڑنے کا موقع دے کر اُس کے لیے باعث اذیّت بنا دیا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کی روح دوبارہ کبھی بھی خوشی نہیں دیکھ سکے گی اور کوئی خوشی آس پاس موجود نہیں تھی جو اُس کے دل میں حرارت پیدا کر سکے۔ تاہم زندہ رہنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہونا ہی چاہیے تھا چنانچہ رنج و غم اور نا اُمیدی نے یہ خلا پُر کر دیا۔ ایسے میں یہ اقدار انسان کی سوچ و فکر کا حصہ بن جاتی ہیں اور جارحانہ تحقیر اُس کو مصنوعی طاقت فراہم کرتی ہے۔ جب میں نے دوبارہ اُس سے بات کی تو اُس نے نگاہیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آنسوؤں اب بھی اُس کے رخساروں سے نیچے بہہ رہے تھے۔ عقیدے کے پُرتشدد نقصان کے احساس کے لمحات گزر چکے تھے۔ ''کیا تم میرے ساتھ ٹھہرنا پسند کرو گی؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔ ''میری بیٹیاں تمہارے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوں گی۔ آؤ میں تمہیں اُن

کے نام بتاؤں۔"اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور سست روی سے میرے پیچھے چل پڑی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ مجھے اپنے بارے کچھ بتاؤ۔اُس کی آنکھوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اچھی طرح پلی بڑھی ہے۔اور جلد ہی اس بات کی تصدیق ہو گئی جب اُس نے اپنے باپ کا نام بتایا۔اُس کا تعلق ایک مشہور خاندان سے تھا۔جب وہ میر پور سے بھاگے تو اُس کا باپ اُس سے جدا ہو گیا۔اُسے اپنی ماں اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ حملہ آوروں نے پکڑ لیا اور علی بیگ کیمپ میں پہنچا دیئے گئے۔وہاں اُس کے ایک چھوٹے بھائی کو اونٹ نے کچل دیا اور وہ شدید درد اور اذیّت کی حالت میں مر گیا۔وہ اس سے آگے کچھ نہ بتا سکی اور اس کا جوان مگر لاغر جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی کسی غلیظ منظر کو دیکھ کر شدّت سے جُھرجُھری لیتا ہے۔میں نے اُس کی یادداشت کو ٹٹولا جس کی وجہ سے اُس کی روح ایک ایسے رنج وغم کا سامنا کرنے کی وجہ سے غم وکا شکار ہو گئی جس نے کمزوری اور بے ہمتی کے احساس کے ساتھ ساتھ اُسے مغلوبیت اور حقارت میں بھی مبتلا کر رکھا تھا۔اُس کی خودی دیوانہ وار دوڑنے لگی اور اُس کی مرضی محض خودی کی خادمہ کے طور پر کام آئی۔یوں لگا جیسے وہ خود اُن کی ذاتی زندگی میں مداخلت کار بن گئی حالانکہ وہ اُن کے مشترکہ فیصلے کا بے بس شکار تھی۔اُس کے بالوں کی ایک لِٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر اُس کی پیشانی پر بکھر گئی جسے میں نے دوبارہ اپنی جگہ پر جما دیا اور اُس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

اُس نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔"کیمپ میں ہم نے بہت خوفناک مناظر دیکھے۔مردوں کو نہر کے کنارے لے جا کر کلہاڑی سے اُن کے سر تن سے جُدا کیے گئے۔اور یہ سب انتہائی اچانک ہوا لیکن نہ کوئی پر تشدّد غم وغصہ تھا اور نہ ہی افسوس اور پچھتاوا۔لڑکیوں اور خواتین کو مسلمان اپنے اپنے گھروں میں لے گئے اور جب مرد اُن سے بیزار ہو گئے تو اُن لڑکیوں اور خواتین کو بارہ بارہ آنے میں حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جیسے اُن معذور جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قابلِ استعمال نہیں رہتے۔"

پھر وہی کہانی۔اگلے مورچوں کی طرف جاتے ہوئے حملہ آور بلاناغہ علی بیگ کیمپ کے قریب ٹھہرتے تھے اور وسیع پیمانے پر کیمپ کی قیدی خواتین کے ساتھ جنسی آوارگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی اُن کی آوارگی اور بدکرداری کی نشاندہی کرے۔کیوں کہ جو بھی ایسا کرتا تھا وہ اُسے گولی مار دیتے تھے۔بچوں کو کھانے کے لیے بہت کم ملتا تھا اور وہ ہمیشہ مزید کھانا مانگتے رہتے تھے۔جب اُنہیں کوئی ناقص راشن ملتا تو اجتماعی طور پر پیچش کے مرض کا شکار ہو جاتے۔"میری ماں کیمپ کی زندگی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور ایک دن کسی سپاہی کو بتایا کہ وہ وہاں سے کہیں جانا چاہتی ہے۔اُس سپاہی نے مجھے دیکھ لیا

اور مجھے اپنے ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ جب اُس نے اپنی بیوی اور والدین کو بتایا کہ میں بھی اُن کے ساتھ رہوں گی تو وہ غضبناک ہو گئے۔ اُن کے گھروں کی خواتین کو شاید علم تھا کہ اُن کے شوہر اُن سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب دوسری عورت ہندو ہو تو گھر میں اُس کے خلاف شکوہ شکایت لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی اُن مقدس کتابوں کا غلط حوالہ دیتے تھے جو انہیں نسل در نسل زبانی موصول ہوتی رہی ہیں اور مطالبہ کرتے تھے کہ کافر عورت کو گھر سے باہر نکال کر کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ لیکن یہ آدمی مجھے ایک اور گھر میں لے گیا اور کچھ عرصہ میرے ساتھ رہا حتیٰ کہ مجھے وہاں سے بازیاب کر لیا گیا۔''

میں اُسے سُدھا کہوں گی۔ سُدھا نے اپنا سر پیچھے پھینک دیا جیسے کسی پریشان کن خیال سے جان چھڑانا چاہتی ہو اور اپنی انگلیاں کن پٹیوں پر بکھرے ہوئے بالوں میں پھیرنے لگی۔ یہ کچھ وہ کسی غرور کی وجہ سے نہیں کر رہی تھی لیکن اُس کے انداز سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے حد بیقراری سے اپنے ماضی کی یادوں کو محو کرنا چاہتی ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ لوگوں کو اپنے بارے اچھی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سُدھا کے ذہن کے عقبی گوشے میں کہیں یہ مبہم سا احساس موجود تھا کہ اُسے زندہ رہنے کے قابل بننے کے لیے اعتماد کی ضرورت ہے۔ انسان کو اپنی اَنا کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عذر کہ اُس کا وجود ہی نہیں بے سُود ہے۔ یہ تصوّر بھی باعثِ تکلیف ہوتا ہے کہ آپ اپنی اَنا یا ذات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ پس منظر میں خفیہ طور پر منڈلا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلسل کام کر رہی ہے۔ دراصل ہر منظر کے پیچھے اصل طاقت وہی ہوتی ہے۔ بہر حال غیر جانبداری کی مختلف سطحوں پر اَنا کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے۔

''تمہاری ماں کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ اب بھی علی بیگ کیمپ میں ہے؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

''نہیں۔ ایک کسان اُسے کیمپ سے لے گیا تھا اور اُسے تنگ کر رہا تھا کہ اُس کے ساتھ شادی کر لے۔ کچھ دن تو وہ مزاحمت کرتی رہی۔ لیکن بعد میں کسی اور اُمید کی عدم موجودگی اور اس آدمی کے تنگ کرنے کی وجہ سے اُس نے اپنے آپ کو آگ کے حوالے کر دیا۔ کسان کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی وہ کافی جل چکی تھی۔ اب چوں کہ وہ اس کے لیے بے سود تھی اس لیے اُس نے دوبارہ اُسے کیمپ میں واپس کر دیا۔''

پھر میں نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا تم ہندوستان جا کر اپنی ماں سے ملنا پسند کرو گی؟ تم میرے ساتھ چل سکتی ہو۔''

جب میں نے ہندوستان کا ذکر کیا تو وہ پھٹ پڑی اور اُس کے اعصاب تھکن کی وجہ سے جواب دے گئے۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کمزوری اور نا اُمیدی کے باوجود مدد حاصل کرنے کے خیال کی مزاحمت

کر رہی ہے۔اس لیے مجھے اُس کے ساتھ محتاط گفتگو کرنی چاہیے۔اُس نے چیخنا شروع کر دیا اور کہا۔"آپ بھی بہت سے دوسرے لوگوں ہی کی طرح ہیں۔شاید آپ بھی میری بہتری نہیں چاہتیں۔آپ کا خیال ہے کہ وہاں (ہندوستان میں) میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا؟ وہ مجھے ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کبھی بھی ہندوستان نہ پہنچ سکوں۔وہ بھی مجھے قبائلیوں کے حوالے کر دیں گے۔"

اُس کے مسلمان شوہر نے اُسے قائل کر رکھا تھا کہ اب اُس کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ شوہروں کو تبدیل کرتی رہے۔اِس امکان اور منظر نے اُسے خوفزدہ کر دیا اور یہی وہ شخص چاہتا بھی تھا۔اُس نے چاہا تھا کہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے ساتھ رہے۔پہلے مسلمان شوہر کا خوف اور وحشت واقفیت اور قربت کی وجہ سے کسی حد تک کم ہو گئی! لیکن وہ اس سلسلے کو بار بار دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن اب صورتِ حال کسی حد تک آسان ہو گئی تھی۔وہ نوجوان اور متاثر ہونے والی تھی اس لیے اُس نے میری کہی ہوئی ہر بات سوال کے بغیر مان لی۔اُس نے کہا کہ وہ ہر اُس جگہ جانے کے لیے تیار ہے جہاں میں اُسے لے جاؤں۔وقت کے ساتھ ساتھ وہ کیمپ کے معمولات کے مطابق ڈھل گئی۔میں نے جب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے اُس کے اندر اپنے لئے محبت کے طاقتور جذبے کا احساس ہوا۔میں اپنے احساسات کی پیمائش تو نہیں کر سکتی تھی اور مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ میں اُس پر رحم کروں گی اُس پر رحم کرنے کا کتنا یقین تھا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔میری بیٹیاں بھی اُس پر بہت مہربان تھیں اور ہم اُسے اپنے گھرانے کا حصہ سمجھتے تھے۔اُس کا شوہر (نام نہاد) روزانہ کیمپ کے چکر لگاتا تھا اور مسلسل خطوط کے ذریعے اُس کی منت سماجت کرتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ واپس گھر چلے۔جب اُسے معلوم ہو گیا کہ اُسے نظرانداز کیا جا رہا ہے تو وہ دوڑ کر گارڈز کے پاس جاتا اور اُنہیں چیخ چیخ کر پکارتا کہ اس لڑکی کو کیمپ سے باہر نکال دو۔وہ اس مؤقف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اب سُدھا ہمیشہ کے لیے اُسے دھتکار چکی ہے۔جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ میری نگرانی میں ہے تو وہ دھمکی آمیز پیغامات کے ذریعے مجھے خطرناک نتائج سے آگاہ کرنے لگا کہ وہ لڑکی اگر اُسے واپس نہ کی گئی تو.....

کسی نے کیمپ نہیں چھوڑا بلکہ نئے نئے لوگ کیمپ میں آتے رہے۔ایک دن ڈپٹی کمشنر کچھ ایسے لوگوں کو لے آیا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔اُن میں گوکل شاہ اور اُس کے بیوی بچے بھی تھے۔وہ میرپور ہی سے تعلق رکھتا تھا اور اچھا خاصا معروف آدمی تھا۔حملہ آوروں نے اُس کے ایک بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔اس حقیقت نے کہ اب وہ مسلمان تھا اور پاکستان کی حکومت کی حفاظت میں تھا صورت حال میں ذرا بھی فرق نہیں ڈالا۔کوئی

بھی حملہ آوروں کو روکنے کی نہ کر سکا جب وہ دندناتے ہوئے کیمپ میں داخل ہوئے اور گوکل شاہ کو اُٹھا کر لے گئے۔ اُنہوں نے اُس کو اذیّت دی اور مجبور کیا کہ وہ اُن کو وہ جگہ بتائے جہاں اُس نے کرنسی دبا رکھی ہے۔ اُس بیچارے نے جو کچھ اُس کے پاس تھا پہلے ہی دے دیا تھا۔ اُس نے بڑے صبر سے یہ بدسلوکی برداشت کی اور کہا کہ اُس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ جب وہ واپس آیا تو وہ جسم پر زخموں کے نشانوں کے بارے بہت حساس معلوم ہوتا تھا اور بار بار پہلو بدلتا رہتا تھا بلکہ کسی سے بات کرتے وقت زخم کے نشانوں کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ شاید یہ اس لیے تھا کہ وہ دوسروں کے دل میں اپنے لیے رحم کے جذبات پیدا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے بہت مددگار ثابت ہوتا تھا لیکن اپنے ذاتی مسئلے کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ اُس نے اپنے بارے صرف ایک بار مجھ سے بات کی اور وہ بھی برسبیلِ تذکرہ۔

گوکل شاہ کی ایک بیٹی تھی جس نے بمشکل اُنہی دنوں سکول چھوڑا تھا جب فساد شروع ہوا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُس کی شادی سعید نامی ایک مسلمان سے کردی گئی۔ دو ماہ گزرنے کے بعد اُس کے شوہر نے محسوس کیا کہ اب بہت ہو چکا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ اُسے سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ فروخت کردیا جائے۔ ایک اور اجنبی کے ساتھ رہنے کے خوف سے لڑکی نے سعید کی منت سماجت کی کہ وہ اُسے اپنے پاس رہنے دے۔ لیکن سعید نے اُسے فروخت کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ اُسی دوران نوجوان لڑکی نے بندوق استعمال کرنا سیکھ لی اور ایک دن جب وہ گھر میں اکیلی تھی تو اُس نے اپنی کنپٹی میں گولی مار کر اپنا خاتمہ کردیا۔ جب سعید واپس گھر لوٹا تو اُسے لڑکی کی لاش اپنی دہلیز پر پڑی ہوئی ملی۔ وہ خوش تھا کہ لڑکی نے خود ہی اُس کا مسئلہ حل کردیا لیکن روپے حاصل کرنے سے محروم رہ جانے کی وجہ سے اُس نے لڑکی کے اقدام کو دھوکہ بازی قرار دیا۔ اُس نے لڑکی کی لاش کو اپنے گھر کے باہر پھینک کر سارے گاؤں والوں کو اُسے دیکھنے کی دعوت دی۔ وہ سب خوفزدہ تھے لیکن جب اُنہوں نے سعید سے اِس کا ذکر کیا تو اُس نے صرف یہ کہا۔ ’’کافر کی بیٹی کے ساتھ اچھا ہوا۔‘‘

سُدھا اور یہ لڑکی بھی اُن بے شمار خواتین میں شامل تھیں جنہوں نے ایک ہی طرح عذاب الیم کا سامنا کیا تھا۔

ہمیں خبر موصول ہوئی کہ ہندوستان کی فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم آزادی کے دِن کے لیے پُر اُمید تھے۔ لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ پاکستانی پسپا ہوتے وقت ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ ایک روز ڈپٹی کمشنر کا بیٹا دوڑتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور کہا کہ مہاتما گاندھی کو قتل کردیا گیا ہے۔ مجھے ایسے کسی اور واقعہ کی یاد

نہیں آ رہی جس نے مجھے اس طرح مکمل طور پر نا اُمید کر دیا ہو۔ میری مزاحمت اور مستقبل کی اُمید بالکل بے مقصد نظر آنے لگیں۔ پاکستان کے بارے سوچتے ہوئے میرا روّیہ خود توصیفی کا تھا کیوں کہ میں اس بات کی قائل تھی کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے ٹھیک جا رہے تھے لیکن اب ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا گیا ہے اور ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ بزعمِ خویش میرے صحیح راستے پر ہونے ہی کی وجہ سے تھا جس نے مجھے اِن حالات میں بھی پُر اُمید رکھا اور یہ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی شخصیات تھیں جنہوں نے مجھ میں یہ احساس پیدا کیا۔ یہ چند روز پہلے کی بات تھی کہ گاندھی جی نے اِن لیے مرن بھرت رکھا تھا کہ ہندوستان میں تمام مذاہب اور قوموں کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور یکجہتی پیدا ہو۔ پھر یہ کتنا خوفناک اور شرمناک فعل ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ میں جانتی تھی کہ قاتل ایک پاگل آدمی تھا اور میرے ملک میں وہ ایک تنہا آواز تھی۔ اسی لیے مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے مجھے اور دیگر ہندوؤں کو جو پاکستان کے کیمپوں میں قید ہیں، کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ ہم نے اس دکھ درد میں بھی اپنے سر فخر سے بلند رکھے تھے۔ یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر کا بیٹا بھی متاثر دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر ہندوستان جانے کے لیے ہمارا وقت آ گیا۔ ڈاکٹر اور کئی دوسرے جو مسلمان ہو گئے تھے اُنہیں پاکستان ہی میں رہ جانے کے لیے کہا گیا۔ وہ میرے کمرے میں آئے اور اس مؤقف کے حق میں دلائل دیئے کہ اگرچہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں پھر بھی ہندوستان میں اُن کی زندگی آسان رہے گی۔ میں نے کیمپ کمانڈر سے اس کا اظہار کیا اور اُسے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا اور بالآخر وہ بھی اس بات پر راضی ہو گئے کہ ڈاکٹر اور اُس کے دوستوں کو بھی ہندوستان بھیج دیا جائے۔

ہمارے گروہ میں بہت سی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں تھیں جس کی وجہ سے مجھے سفر کے منظر نامہ سے خوف آتا تھا۔ کیمپ کمانڈر نے مجھے پاس سے گزرتے ہوئے روکا اور سرگوشی میں کہا۔ ''یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ اِن سب خواتین کو لے کر ہندوستان جا رہی ہیں لیکن راستے میں آپ کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک سپاہی اور کوئی ایک پولیس آفیسر یہ منصوبہ بنا چکے ہیں کہ وہ ان دو لڑکیوں کو اغواء کریں گے جن کی آپ دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں۔'' میں نے کیمپ کمانڈر کا مسرّفانہ حد تک شکریہ ادا کیا اور جب میں اُس سے رخصت ہونے کے لیے اجازت لینے لگی تو صرف اتنا کہہ سکی۔ ''مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایک دوست کی محفل سے رخصت ہونا پڑ رہا ہے۔'' مجھے خوشی ہے کہ اُس نے بھی اِسے ایک ناکافی بیان کے طور پر ہی قبول کیا۔

میں نے اُن دونوں لڑکیوں سے کہا کہ وہ اپنے بالوں کی تہہ (Plaits) کو کھول دیں تا کہ اُن کے

بال جھالر کی طرح اُن کے چہروں کو ڈھانپ دیں۔اُنہوں نے دو پرانے کمبل بھی اپنے اردگرد لپیٹ لئے اورانہی سے سر بھی ڈھانپ لئے اور تاریکی میں ایک موٹی اور چھوٹی بوڑھی خاتون کی طرح چلتے ہوئے دکھائی دینے لگیں۔اوراب تاریکی بھی پھیل چکی تھی۔

پاکستانی فوج کے سپاہی قریب سے گزرتی ہوئی ہر خاتون کے چہرے کوغور سے دیکھتے تھے لیکن جن لڑکیوں کو وہ تلاش کررہے تھے، وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ بلکہ کمبلوں کے نیچے کانپتے ہوئے پہلے ہی گزر چکی تھیں۔

کھلے آسمان تلے کھیتوں سے گزر کر ہمیں گاڑی پکڑنے کے لیے سڑک پر پہنچنا تھا۔ہم نے پہلا پڑاؤ تو مکمل کرلیا تھا جب کہ ہوا بہت تیز اور سرد تھی۔کئی ٹرک وہاں ہمارا انتظار کررہے تھے جن کے ساتھ ریڈ کراس کے ورکرز، جن میں دو خواتین اور ایک مرد تھا، بھی تھے جو ہمیں الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔جوں ہی خواتین ٹرکوں پر سوار ہوئیں میں نے ایک ایک کر کے اُن سب کی گنتی کی۔ہم سب مردوں اور بچوں سمیت ایک سواسی لوگ تھے۔میں نے فیصلہ کیا کہ میں آخری ٹرک میں بچوں، سُدھا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھوں گی۔تمام ڈرائیور مسلمان تھے اور ہر ٹرک میں چند سپاہی بھی نگرانی کے لیے موجود تھے۔ہم نے بمشکل سفر شروع کیا تھا کہ ہمارے ٹرک کو روک لیا گیا۔قبل اس کے کہ ہمیں معلوم ہو کہ کیا معاملہ ہے دو آدمی ٹرک پر چڑھ گئے۔ڈرائیور اُن کو جانتا تھا اور وہ بھی اُس کی تلاش میں تھے۔اُن میں سے ایک کسان نظر آتا تھا اور دوسرا وردی پوش سپاہی تھا۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور کہا۔''آپ کو مجھے بچانا ہوگا۔یہ وہی ہے جو میرا شوہر ہونے کا مدعی ہے۔اوراب وہ یہاں پہنچ گیا ہے۔''اِسی اثنا میں وہ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ہرلحہ کسی ایسے ناخوشگوار واقعہ کی توقع میں گزرتا تھا کہ اگر وہ واقع ہو گیا تو میں لڑکی کو سپاہی سے بچا کر لے جانے کے لیے کچھ نہ کرسکوں گی۔لیکن بس مسلسل سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔سپاہی اچانک اپنی سیٹ سے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔''تم جانتی ہو کہ میں اس لڑکی کی وجہ سے کس مصیبت میں مبتلا رہا ہوں؟ میرا سارا خاندان اب میرے خلاف ہے لیکن میں اُسے یہ اختیار دیتا ہوں کہ یہ جو چاہے کرے۔''

اُس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔وہ بالکل غیر رسمی طور پر اُس نکتے پر آ گیا جو اُس کے ذہن میں سب سے اُوپر تھا۔لیکن مجھے اپنے خیالات کو کھنگالتے ہوئے اور یہ سمجھنے میں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے چند لمحے تک انتظار کرنا پڑا۔مجھے یہ محسوس کر کے بے حد اطمینان ہوا کہ سپاہی اس لڑکی کے خلاف پُرتشدد عزائم نہیں رکھتا اور وہ درحقیقت اُس کے ساتھ محبت کرتا تھا۔یہ واقعہ گاندھی جی کی شہادت کے بعد پہلا حوصلہ افزا واقعہ تھا جس سے انسانیت کے

بارے میرا کمزور ہوتا ہوا عقیدہ از سرِ نو بحال کر دیا۔ گزشتہ کئی ماہ سے کئی مراحل پر میں اس قدر مایوس ہوگئی تھی کہ میں نے لوگوں پر اعتماد کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی مایوس ہوگئی تھی۔ تمام اُمیدوں سے محروم ہونے کے علاوہ ایک خود دارانہ خوف بھی ہوتا ہے کہ ہم نے جن اقدار کا انتخاب کیا تھا وہ سب غلط ثابت ہوگئی ہیں۔ ''ہاں، میں ساری کہانی جانتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر تمہاری طرح کے زیادہ لوگ ہوتے تو بہت سی لڑکیاں بچ سکتی تھیں۔ اگر تم نہ ہوتے تو یہ بے چاری لڑکی آج رات ہندوستان نہ جا رہی ہوتی۔'' اپنی گفتگو کے دوران یہ جاننے کے لیے کہ اُس کا ردِّعمل کیا ہے، میں مسلسل اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

ہم بمشکل چند میل آگے آئے ہوں گے کہ وہ دوبارہ بولا اور یہ تاثر بہت خوش کن تھا کہ اُس نے اپنے اُنہی جذبات پر زور دیا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا درست کہا تھا۔ اُس نے دوبارہ مجھے کہا کہ میں اس لڑکی کو ہندوستان لے جاؤں اور اس بات کا خیال رکھوں کہ اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ میں اس کو اس کی والدہ کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد اُس نے ڈرائیور کو بس روکنے کے لیے کہا اور وہ اور کسان دونوں بس سے باہر نکل گئے۔ میں باہر ارد گرد دیکھتی رہی اور دیکھا کہ وہ ہمیں نرمی اور نزاکت سے دیکھ تو رہا ہے لیکن اُسے نہ تو کوئی افسوس ہے اور نہ ہی پچھتاوا۔

سرائے عالمگیر پہنچ کر ہم ایک ریل گاڑی پر سوار ہوئے جو علی بیگ کیمپ سے لائے گئے مہاجرین سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ مسز مودی، لڑکیاں و یمل اور میں سب ایک ہی ڈبے میں تھے۔ سرلیش اور ملازمین کو ہم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اُس کیرج میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے کہ اور کتنے لوگ اِس میں ڈال دیئے گئے ہیں۔

جلدی میں کسی ایک نے دیا سلائی جلائی تو میں نے دیکھا کہ سونے کی تمام سیٹیں پُر ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے مسز مودی اور بچوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ کا انتظام کیا۔ ہم نے اس تاریک ڈبے میں جو بالکل پنجرے کی طرح تھا، کئی گھنٹے بیٹھ کر گزارے۔ ٹرین نے صبح چار بجے روانہ ہونا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ ایک سیاہ بادل کے پیچھے سے نکل کر نمودار ہوا اور اس کی ٹھنڈی اور کمزور روشنی میں میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے مدھم خط و خال دیکھ سکی۔ میں اپنے کیمپ سے جاگیردار کے خاندان کے لوگوں کو پہچان گئی۔ اُن کی ایک خاتون میری بیٹی شیلا کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بازوؤں میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میری نگاہ گھومتے گھومتے کمپارٹمنٹ کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئی اور بار بار ایک دیکھے بھالے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک ایک خاتون کی چیخ نے مُہرِ سکوت توڑ دیا۔ یہی وہ عورت تھی جو شیلا کے بالکل ساتھ بیٹھی ہوئی

تھی۔ میں نے مڑکر دیکھا کہ ایک آدمی اُس کا بازو کھینچ رہا تھا۔ ''مجھے اس بچے کو کسی کے حوالے کرنے دو۔ پھر میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' وہ بَین کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ اُس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو اُس عورت نے چھلانگ لگا کر 'برتھ' کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی۔ وہ آدمی پاکستانی فوج کا سپاہی تھا اور وہ اُس کی چالاکی سمجھ کر غضبناک ہو رہا تھا، جو خاتون نے اُس کے ساتھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے پسلیوں کے درمیان ایک تیز چھبن محسوس کی اور ایک خنجر کی چمک بھی دکھائی دی۔ دو غضبناک آنکھوں نے میری آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور حلق سے نکلتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تم نے اُسے کہاں چھپا رکھا ہے ورنہ میں یہ خنجر آخری دعا کرنے سے پہلے ہی تمہارے سینے میں گھونپ دوں گا۔'' اُس نے ننگا خنجر میرے چہرے کے بالکل قریب رکھ کر پکڑا ہوا تھا جو چاند کی روشنی میں تیل کی چمک دکھا رہا تھا۔ اب اُس کی نظر اچانک اُن لڑکیوں پر پڑ گئی جو دوسرے کونے میں گٹھڑی بنی ہوئی تھیں۔ مجھے دھکا دے کر وہ اُن لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے اُس نے پوچھا۔ ''یہ کس کی لڑکیاں ہیں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میری''۔

اتنے میں اُس کی نظر اُس عورت پر پڑ گئی جسے وہ تلاش کر رہا تھا اور جو 'برتھ' کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ سپاہی نے اُسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اُس کی ماں نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور چیخیں مارنے لگی۔

آدمی گھبرا کر بھاگ گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس حادثے کے بارے بالکل نہیں سوچوں گی۔ میں ہندوستان کے بارے سوچنا چاہتی تھی۔ جلد ہی پو پھٹ گئی اور ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی امرتسر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک نیا دن، اور میں پُراُمید تھی کہ ہم سب کے لیے ایک نئی زندگی شروع ہو چکی ہے۔

24

پنڈت نہرو کے ساتھ ایک انٹرویو

جوں ہی ہم امرتسر پہنچے تو ٹرین نے ایک موڑ کاٹا اور میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ میں فکرمند چہروں کو لمبی ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بلکہ آخری بوگی کے آخری حصے تک نظریں گاڑے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ جوں ہی سٹیشن قریب آیا، ٹرین ذرا آہستہ ہوئی اور پھر جھنجھناہٹ کے ساتھ زور سے آگے کی طرف لپکی۔ جب رُکی تو میرے کمپارٹمنٹ کا ہر شخص پلیٹ فارم کو دیکھنے کے لیے باہر دوڑ پڑا لیکن میں مسلسل اور جان بوجھ کر اپنی جگہ پر ڈٹی رہی تا کہ میرا تجسّس کچھ اور بڑھ جائے۔ میں نے نئی آزادی کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے ہوا کو سونگھا۔ اپنے وطن میں واپسی بہت اچھی لگی۔ اس کا مطلب خوف اور ذلت سے آزادی تھی اس لیے کئی ماہ کے بعد میں نے واقعی سُکھ کا سانس لیا۔

لوگوں کا ہجوم تھا۔ دوست، رشتہ دار، سماجی کارکن اور اُس کیمپ کی انتظامیہ جہاں ہمیں لے جایا جارہا تھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اور خوش خلقی کا اظہار کر رہے تھے۔ پھر جوں ہی مہاجرین ٹرین سے اُترے تو یہ لوگ اُن کا استقبال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ مکمل درستگی کے ساتھ کام کر رہے تھے اور ایک کیرج سے دوسرے کیرج کی طرف دوڑ کر جارہے تھے اور چند ہی منٹوں میں ہماری دیکھ بھال شروع ہوگئی۔ اُنہوں نے ہمارے کھانے کے لیے بہت سی چیزیں لائیں اور اس کے علاوہ مٹھائی اور پھل فراوانی کے ساتھ فراہم کیے گئے۔ یہ چیزیں ہر طرف پھیلا دی گئیں اور جلد ہی کھانا غائب ہوگیا۔ کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ کس نے کتنا کھایا ہے۔ ہم بھوکے تھے اور وہ لوگ ہماری تواضع کر رہے تھے جن کی مہمان نوازی ہمارے لیے قابلِ قبول تھی۔ اس کے برعکس مجھے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے کیمپ میں خواتین کے بجھے ہوئے چہرے یاد آرہے تھے جب وارڈر اپنے روزانہ کے دورے پر آکر کھانا تقسیم کرتا تھا۔ میں بھی بھوکی تھی لیکن کھانے کے معاملے میں میں ہمیشہ کی طرح ٹال مٹول کرتی رہی۔ مجھے احساس تھا کہ میں اس ارفع لمحے کے ذائقے کو اپنے خلق میں برقرار اور محفوظ رکھنا چاہتی تھی اور میں جانتی تھی کہ کیوں؟ میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنے ماضی کو اس کے سارے دُکھوں اور زیادتیوں سمیت

پہلے ہی ہضم کرلیا ہے۔ روح اتنی مغرور تھی کہ وہ جسم کی تلخیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے ماضی کا سارا زیاں تجربے کا لازمی حصّہ معلوم ہونے لگا۔ ایسے میں وہ رشتہ دار بھی جو تسلّی دینے کے لیے آئے تھے خوشی کے ماحول کو ضائع کرنے کا باعث بن گئے اس لیے میں نے ماضی کو کُھر چنے پر اُن سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

میں نے سُنا کہ کشمیر کے تمام مہاجرین کو 'کرک شیٹرا' (Krrukshtra) کے کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے۔ یہ جگہ وہ مشہور میدانِ جنگ ہے جہاں پانڈوؤں اور کوروؤں نے خدا کی ہدایت کی روشنی میں ایک خونی جنگ لڑی تھی۔ اس کے نتیجے میں دُنیا میں عدل وانصاف بحال ہوا تھا اور بھگوت گیتا انسان کی نئی نسلوں کے حوالے کی گئی تھی۔ میں بذات خود وہاں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور کچھ وقت کے لیے امرتسر ہی میں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی جو مجھے کچھ دن کے لیے وہاں ٹھہرا سکے۔ اتنے میں 'کرک شیٹرا' کیمپ کی انتظامیہ کی ایک خاتون میرے پاس آگئی۔ کیا تم کرک شیٹرا جانے کے لیے ٹرین نہیں پکڑ رہی؟'' اُس نے مجھ سے پوچھا۔ جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے سمجھا کہ میں وہاں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ اُس نے مزید کہا۔'' مقامی کالج میں ایک کیمپ میری نگرانی میں چل رہا ہے اور چوں کہ آپ یہاں ٹھہرنے کو ترجیح دیتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں، اس لیے میں کوشش کروں گی کہ میں آپ کو کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہراؤں۔ لیکن اس کے لیے مجھے حکّامِ بالا سے اجازت حاصل کرنا پڑے گی۔ اور اگر اُنہوں نے آپ کی درخواست کو مسترد کر دیا تو آپ میری مہمان کی حیثیت سے ٹھہر سکتی ہیں۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اُس کا نام بی بی سنت کور ہے۔ وہ پینتالیس سال کے پیٹے میں ایک خوش گفتار خاتون تھی۔ میں نے اپنے دیگر ساتھی مسافروں کو الوداع کیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ میں کرک شیٹرا کیمپ میں اُن سے ملنے جایا کروں گی۔

ہمیں اُس کمرے کے ساتھ والا کمرہ دیا گیا جس میں بی بی سنت کور رہائش پذیر تھی۔ اور وہ ہمیں آرام دہ رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کیمپ میں ہندو اور مسلمان خواتین رکھی گئی تھیں۔ اغواء شدہ مسلمان خواتین بازیابی کے بعد اُس وقت تک یہاں رکھی گئی تھیں جب تک اُنہیں پاکستان یا ہندوستان میں ان کے رشتہ داروں کے حوالے کیا جاتا۔ اسی طرح اغواء شدہ ہندو خواتین جو پاکستان سے واپس پہنچی تھیں کو بھی اُس وقت تک یہاں رکھا گیا تھا جب تک وہ رشتہ داورں کے حوالے کی جاتیں۔ یتیم بچوں کی مستقل کفالت ریاست کی ذمہ داری تھی۔ کیمپ کی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور خواتین ملازم ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے سنبھال کر رکھ رہی تھیں۔ خواتین کو دودھ اور پھل باقاعدگی سے روزانہ ملتے تھے۔ کیمپ کی انتظامیہ نے سلائی اور کڑھائی کی کلاسوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا جس میں کشیدہ کاری کے علاوہ سینا پرونا

بھی سکھایا جاتا تھا۔نزدیک ہی ایک سینما بھی تھا جس میں ہم سب ہفتے میں دو مرتبہ فلم دیکھتے تھے۔زندگی بے حد آسان اور آرام دہ ہوگئی تھی لیکن خواتین میں پھر بھی بے توجہی اور بیکاری کا احساس موجود تھا۔

بی بی کور نے مجھے مطلع کیا کہ ایک ٹرین مظفر آباد سے مہاجرین کو لے کر آرہی ہے جو چار بجے سہ پہر یہاں پہنچے گی اس لیے وہ سٹیشن پر جارہی ہیں۔میں نے بھی اُس کے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ہم ذرا جلدی وہاں پہنچ گئے اور پہلے کی طرح آج بھی مہاجرین کا استقبال کرنے کی مکمل تیاریاں کی جاچکی تھیں۔مظفر آباد سے کئی آنے والوں جنہیں میں اچھی طرح جانتی تھی، سے مل کر بہت خوش ہوئی۔اُن میں چمن لال بھی تھا۔وہ اب امرتسر میں تھے اور 'کرک شیٹرا' کیمپ کی طرف جارہے تھے۔چمن لال اور میں نے اُس کی روانگی سے قبل اپنے اپنے نوٹس ایک دوسرے کو دکھائے۔مظفر آباد میں صورت حال یقینی طور پر روبہ اصلاح نہیں تھی۔مسز مودی اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے کے لیے سری نگر کوچ کرگئی تھی۔

چندروز بعد ہم بھی 'کرک شیٹرا' چلے گئے اور بی بی کور نے مجھے کیمپ کمانڈر کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا جس کا نام کرنل پُوری تھا۔کرنل پوری نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ایک خیمہ بھی دیا جو صرف ہمارے لیے تھا۔اس کیمپ میں تقریباً دولاکھ مہاجرین تھے اور میرے لیے یہاں ایڈجسٹ (باقاعدگی اختیار کرنا) ہونا بہت آسان تھا۔میں اُن لوگوں کے ساتھ جنہیں میں اچھے دنوں سے جانتی تھی واپس آکر بہت خوش تھی جن میں شیوادیال، چمن لال اور مظفر آباد ہی سے کئی دوسرے شامل تھے۔کرنل پوری ہمیشہ کیمپ کے معاملات میں مصروف رہتا تھا اور اُس کی بیوی اور دو بیٹیاں بھی مختلف کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔اُس نے میرے لیے بھی کیمپ میں کچھ نہ کچھ مفید کام کرنے کا انتظام کرلیا تھا۔

مجھے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہمارے اطمینان اور آسانی کا سب سے بڑا سبب کیمپ کا ہمدردانہ ماحول تھا۔نہ تو وہاں جنگ کے بارے گرما گرم باتیں ہوتی تھیں اور نہ ہی خوف لوگوں کے ذہنوں میں غلاظت بھر سکتا تھا اور عورتوں کو بھی بلی کی طرح کی خصوصیات کی نمائش کرنے کی ضرورت درپیش نہ تھی۔سیاسی راہنماؤں میں بھی یہ عزم پایا جاتا تھا کہ وہ آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے اہل ہیں اور مقابلہ کرکے اِن کا حل نکال لیں گے۔لیکن کیمپ میں ایک ایسی خاموش رضامندی کا عالم تھا کہ کوئی جارح کا ذکر نہیں کرتا تھا۔وعظ ونصیحت بالکل نہیں تھی لیکن ہر شخص کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ سب سے اہم بات زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا ہے۔جب ہم پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں تھے تو جہاد کے امکانات بہت خوفناک تھے لیکن یہاں دُنیا ہمیں صرف ہنسنے کا سبق دیتی تھی۔اس کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں کوئی بھی شخص ہتھیار اُٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کا انٹرویو کرنے کی اجازت کے لیے کہا ہوا تھا اور اس مقصد کے لیے دہلی جانے کے لیے پُر اُمید تھی۔ لیکن ایک دن کرنل پوری نے مجھے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کیمپ میں آرہے ہیں اور وہ مجھے بھی ملیں گے۔

پنڈت نہرو تشریف لے آئے۔ مجھے اُن کے پاس لے جایا گیا۔ ہندوستان کا وزیر اعظم سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور تقریباً ایک منٹ تک میں کچھ کہے بغیر اُن کے سامنے کھڑی رہی۔ میں مرعوب نہیں تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ بات کیا کروں۔ مجھے اس بات پر کافی تعجب ہوا کہ خاموشی خاموشی ہی میں میں نے اپنے ماضی قریب کے چند ماہ کے تجربات کی تفصیل کو اپنے ذہن میں ترتیب دے ڈالا۔ یہ کسی بڑی شخصیت کی موجودگی میں اکثر ہو جاتا ہے کیوں کہ آپ کے ساتھ اُس کی خاموش افہام وتفہیم (Understanding) آپ کے یقین اور اعتماد کو پختہ اور مضبوط کر دیتی ہے۔ آپ کو اس لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی کیوں کہ یہ سب کچھ فرض کر لیا جاتا ہے۔ اور آپ کو ہمیشہ اُمید ہوتی ہے کہ آپ کو اُن کہی باتوں کی وجہ سے جانچا اور تولا جائے گا۔

اپنے استغراق سے میری خوشگوار توجہ اُس وقت مبذول ہوئی جب میں نے سُنا۔ ''کیا آپ بیٹھنا پسند کریں گی؟ اور مجھے اپنے بارے کچھ بتائیں۔'' یہ ایک بہت شیریں آواز تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ جو اُنہیں سننے جاتے تھے کیوں کر پُر اُمید ہو کر واپس آتے تھے۔

میں نے اپنی کہانی کے وسیع خط وخال، تجربات ومشاہدات اُن کے سامنے بیان کئے اور جب میں نے اپنے بچوں کا ذکر کیا تو اُنہوں نے اُن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ شام کو چائے پر کرنل پوری کے گھر آئے اور اُن کی دعوت پر میں وہیں سے اُن کے ساتھ ہی اُن کی کار میں دہلی روانہ ہو گئی۔ مجھے ٹھہرنے کے لیے مہمان خانے کا ایک کمرہ دیا گیا۔ پنڈت نہرو کہیں باہر کھانے پر گئے ہوئے تھے اور جب واپس آئے تو مجھے ملے۔ اُنہوں نے کہا۔ ''کرشنا! تمہیں اب اپنے آپ کو ہمارے خاندان کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ میں تمہارے بچوں کو سکول بھیجنے کا انتظام کروں گا۔''

ایک ہفتے کے بعد میں 'کرک شیتر' گئی تاکہ اوم اور بچوں کو دہلی لے کر آجاؤں۔ ہم وہاں تقریباً دو ماہ تک ٹھہرے رہے اور اس دوران مسز گاندھی بے حد مہربان اور فکر مند رہی۔ بچوں کو نینی تال کے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ مئی 1948ء میں کشمیر کے دورے کے دوران میں بھی پنڈت نہرو کے ساتھ وہاں گئی جہاں انہوں نے میرے لیے کام تلاش کر لیا۔ ایک 'سادن' کشمیر کی خواتین کو گھریلو دستکاریاں سکھانے کے لیے قاعدہ کلاسیں لیتی تھی۔ میرا بھائی جو چھ ماہ کی رخصت پر تھا اور مجھے ملنے کے لیے آیا تھا میرے لیے بہت مددگار ثابت

ہوا۔شروع شروع میں لوگوں کا ردِّعمل کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا لیکن چھ ماہ کے عرصہ میں ادارہ نے تیز رفتار ترقی کی اور پانچ سو سے زیادہ خواتین کے لیے زندہ رہنا ممکن بنا دیا۔اس کی تین شاخیں۔بارہ مولہ، ہبک باد، چٹی بادشاہی، میں قائم کی گئیں۔اس کے علاوہ 'سادن' کے تحت محتاج بچوں کے لیے ایک 'مانٹیسوری سکول' بھی شروع کیا گیا۔ بلکہ ہسپتال بھی قائم کیا گیا جسے انڈین آرمی کا سٹاف چلاتا تھا۔

تقریباً انہی دنوں میں نے سُنا کہ میری بہن لکشمی کا انتقال ہو گیا تھا۔وہ بھی کشمیر ہی میں تھی اور اُس کا شوہر حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور لکشمی اس صدمہ سے کبھی باہر نہ آسکی اور بالآخر جان کی بازی ہار گئی۔انہوں نے اپنے پیچھے تین بچے چھوڑے تھے۔میں نے اپنے شوہر اور لکشمی کے علاوہ بھی بہت کچھ کھویا تھا اور اس لیے میری یادداشت پر دیگر کئی زخموں کے غلیظ نشان بھی تھے۔لیکن میں جس ابتلا سے نکل کر آئی تھی اُس کے مقابلے میں ذرا بہتر محسوس کرتی تھی۔میں دوسروں کے دُکھ درد کو سمجھنے اور کبھی کبھی اُن کے کام آنے کی وجہ سے بھی بے حد شکر گزار تھی جو شاید خود ترحمی (Self pity) کا واحد علاج ہے۔میں ایسی صورت حال اور ایسے لوگوں کی جن کے درمیان رہ کر میں نے شکست کے تلخ ذائقے کو محسوس کیے بغیر جھکنا سیکھا، بے حد شکر گزار ہوں۔

مجھے ٹھیکیدار کے کیمپ کے دو حادثات خاص طور پر یاد آئے۔جن مناظر کو میں اب بھی چشمِ تصور سے واضح اور شعوری طور پر دیکھتی ہوں اور یاد کرتی ہوں بلکہ دیکھتی ہوں کہ جب ایک عورت کے بازوؤں میں بیمار بچہ تھا اور وہ اندر اور باہر کے ہر دکھ درد کو بھول کر اور ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر بچے کو بہلا رہی تھی۔اور دوسرا یہ کہ ٹھیکیدار نے اس قدر اصرار کیا کہ میں اُس عورت کی اچھی طرح دیکھ بھال کروں جو شدید قسم کے پیچش کے مرض میں مبتلا تھی۔وہ مجھے اُس کا کمرہ تو صاف نہیں کرنے دیتا تھا اور جب بھی میں ایسا کرنے لگتی تھی تو وہ معذرت کے الفاظ منہ میں دہراتے ہوئے مجھے ایک طرف دھکیل دیتا تھا۔یہ اس لیے نہیں تھا کہ اُسے اپنے آپ پر اعتماد نہیں تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ قدرت نے اُسے حقیقی اور فطری عجز و انکسار سے نواز رکھا تھا اور اُس نے کبھی اپنی تسلی و تشفی کے لیے مسئلے کا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ایسے لوگوں کے بارے کسی مصنف اور ماہر نفسیات نے آخری بات کہنے کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کی۔انسان کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جاننے اور اُن میں رہنے کی رعایت حاصل کرنے پر فخر محسوس کرے۔لیکن مجھے صرف ایسے لوگوں کو ہی یاد نہیں کرنا بلکہ بہت کچھ یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔بے شمار حادثات اور اس نوع کے لوگوں کی ورائٹی سب مل کر میری یادداشت میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔دراصل اس مختصر سے وقت میں اتنے ڈھیر سارے تجربات کا قدرتی طور پر یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔